کس کے لیے

استاذہ نگہت ہاشمی

النور پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کس کے لئے؟

استاذہ نگہت ہاشمی

کس کے لئے؟

استاذہ نگہت ہاشمی

النور پبلیکیشنز

نام کتاب	:	کس کے لئے؟
مُصنّفہ	:	نگہت ہاشمی
طبع اوّل	:	مئی 2007ء
تعداد	:	2100
ناشر	:	النور انٹرنیشنل
لاہور	:	98/CII گلبرگ III فون: 042-7060578-7060579
فیصل آباد	:	103 سعید کالونی نمبر 1، کینال روڈ فون: 041 - 872 1851
بہاولپور	:	7A، عزیز بھٹی روڈ، ماڈل ٹاؤن اے فون: 062 - 2875199 2885199، فیکس : 062 - 2888245
ملتان	:	888/G/1، بالمقابل پروفیسرز اکیڈمی، بوسن روڈ، گلگشت فون: 061 - 600 8449
ای میل	:	alnoorint@hotmail.com
ویب سائٹ	:	www.alnoorpk.com

النور کی پراڈکٹس حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں:

مومن کمیونیکیشنز B-48 کرین مارکیٹ بہاولپور

فون 062 - 2888245

قیمت	:	روپے

ابتدائیہ

کس کے لیے؟

یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب لمحے لمحے انسان کو دینا پڑتا ہے۔ میں کس کے لیے جیوں؟ میں کس کے لیے کماؤں؟ میرا کون ہے؟ جس کے لیے خرچ کروں؟ میں کس کے لیے محنت کروں؟ میں کس کے لیے قربانیاں دوں؟

انسان کی فطرت اس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ کسی کے لیے کچھ کرے۔ یوں لگتا ہے اس سوال سے انسان کا خمیر گندھا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے اس کی نس نس میں، اس کے لہو کی ہر بوند میں، اس کی ہڈیوں، اس کے پٹھوں، اس کے دماغ، اس کے دل میں یہی احساس گندھا ہوا ہے۔ ''کسی کے لیے'' لیکن اس فطرت کو جب صحیح راہ نمائی نہیں ملتی تو انسان ہر دَر سے ٹھوکریں کھاتا ہے، کبھی وہ مایوس ہو کر کہتا ہے کس کے لیے؟ اور کبھی پرُامید ہو کر اس تلاش میں لگ جاتا ہے کہ کس کے لیے؟ بچپن میں انسان کا رخ ماں کی طرف ہوتا ہے تو ہر کام ماں کی خوشی کے لیے کرتا ہے، پھر خوشیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو اس میں باپ، بہن بھائی، دوست احباب شامل ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں جیون ساتھی کو اس کا حق دار سمجھتا ہے لیکن ہر تجربے کے بعد بھی اس سوال کا اسے مسلسل سامنا کرنا پڑتا ہے ''کس کے لیے''؟ یہ سوال

انسان کو اندر سے خالی اور کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ذات کے اس خلا کو کون سی چیز پر کرتی ہے؟

وہ ”لِلّٰہ“ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کا ہے، اسے اُسی کے لیے سب کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے احساسات بھی اللہ کے لیے ہوں، اس کے جذبے، اس کی سوچیں، اس کے افکار، اس کی قربانیاں، اس کی عبادتیں، اس کے سجدے، اس کا جینا اور اس کا مرنا اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ جیسے ربّ العزت فرمایا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(الانعام:162)

”آپ کہہ دو: یقیناً میری نماز، میری قربانیاں، میرا جینا، میرا مرنا، اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے“۔

لِلّٰہ انسان کو زمین سے اوپر اٹھا دیتا ہے۔

لِلّٰہ انسان کے مقاصد کو بلند کر دیتا ہے۔

لِلّٰہ فرش پر رہنے والے کا عرش والے کی خاطر سب کچھ کر ڈالنے کا اظہار ہے۔

لِلّٰہ انسان کو خالص کر دیتا ہے، کھوٹ سے پاک کرتا ہے۔

لِلّٰہ سے انسان اصل حقیقت کو پالیتا ہے۔

لِلّٰہ ایک بار کا نہیں لمحے لمحے کا معاملہ ہے۔

لِلّٰہ تو شعوری طور پر اپنے آپ کو، اپنی ہر چیز کو مالک کے حوالے کر دینے کا عزم ہے۔

لِلّٰہ تو Realization ہے۔ اپنی حقیقت کا اِدراک ہے کہ میں کون ہوں؟ کس سے میرا تعلق ہے؟ کس کی خاطر سب کچھ کرنا ہے؟

لِلّٰہ تو اخلاص کا سفر ہے۔ خلوص کا تو ہر کوئی تمنائی ہے لیکن ربّ سے زیادہ اس کا کون

حقدار ہوسکتا ہے؟ اگر اپنی زندگی میں دیکھیں تو بات ِ اللہ سے شروع ہوتی ہے اور اللہ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے جیسے ربّ العزت نے فرمایا:

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ (البقرہ:156)

''یقیناً ہم اُسی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

جب ہیں بھی اُس کے اور جانا بھی اُسی کے پاس ہے تو کیوں نہ ہر کام اللہ کریں۔

نگہت ہاشمی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ
اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (284) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ
رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا
نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق ز غُفْرَانَكَ
رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (285) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ
اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِنَا ؕ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفہ وَاغْفِرْ لَنَا وقفہ
وَارْحَمْنَا وقفہ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (286)

ترجمہ:

”اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا۔ پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے

والا ہے۔رسول ایمان لایا ہے اس چیز پر جو اس کے ربّ کی طرف سے اس پر نازل کیا گیا اور مومن بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔سب ہی اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔اس کے رسولوں میں سے ہم کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔وہ سب کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں اور ربّ تیری ہی طرف ہمارا لوٹنا ہے"۔

سورۃ البقرہ کے آخری رکوع میں ربّ العزت فرماتے ہیں:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (284)

"اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔تم اپنے دل کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا۔پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"۔

آیت کے حوالے سے توجہ طلب اُمور دیکھئے گا:

پہلا لفظ بہت Comprehensive ہے 'لِلّٰہ'، اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔سورۃ کا اصل Message بھی یہی ہے۔اللہ تعالیٰ کے ہو جاؤ۔اللہ تعالیٰ کے غلام بن جاؤ۔بات ہے لِلّٰهِيَتْ کی اور لِلّٰهِيَت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

کس کے لئے؟

”اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے“۔

کون کون سی چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے؟ آسمان دیکھو! زمین دیکھو! پھر اپنی ذات کو دیکھو! پھر اپنی دنیا کو دیکھو! ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ہے۔

دوسری توجہ طلب بات اسی سے Relevant ہے۔ بات ہے انسانی معاملات کی۔ انسان تھوڑا سا ظاہر کرتا ہے اور زیادہ چھپا لیتا ہے اس لیے کہ انسان دنیا کے لوگوں میں عزت چاہتا ہے اور انسان ہوں یا دوسری مخلوقات ظاہر پر فیصلہ کرتے ہیں۔ دل کس نے دیکھا ہے؟ دل دینے والے نے، دل بنانے والے نے، اس لیے اس نے دلوں کے اندر یہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے:

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا

”اور اگر تم ظاہر کرو“۔

کس چیز کو؟

مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ

”جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ حساب لے لے گا“۔

پہلے کے بعد اب دوسرا رویہ آ گیا۔ ایسا لگتا ہے ایک انسان جو کچھ کر رہا ہے، چھپانا چاہتا ہے اور چھپتا نہیں، ظاہر کرنا چاہتا ہے تو دل برا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں: دنیا کو نہ دیکھو، یہ دیکھو:

يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ

”اللہ تعالیٰ تم سے حساب لے لے گا“۔

حساب لینے والے کو یعنی اللہ تعالیٰ کو دیکھو! آیت کے اتنے سے حصے سے رب نے

لِلّٰہیت سکھادی۔ کیسے سکھائی ہے کہ پھر انسان کے دل کو تکلیف ہوتی ہے کہ ربّ کے سامنے تو سب کچھ open ہے، انسان guilt میں آجاتا ہے اور ربّ انسان کی تڑپ کو دیکھتا ہے تو مہربان ہوجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ

"پھر وہ معاف کردے گا جس کو چاہے گا"۔

بات ہے مغفرت کی لیکن اختیار اس کا ہے۔

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ

"اور وہ عذاب دے گا جس کو وہ چاہے گا"۔

اختیار اس کا ہے، مغفرت بھی اس کے کنٹرول میں ہے، عذاب بھی اس کے کنٹرول میں، فیصلے اس کے ہیں کیونکہ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

"اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے"۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہے اور انسان بھی اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا ثابت کیا ہے؟ اتنی comprehensive بات ہے! اتنا زبردست کلام ہے! ایسے لگتا ہے کہ ایک آیت پوری کائنات کی کہانی ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (284)

"اور اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"۔

دیکھو! قدرت کس کی ہے؟ دیکھو! اختیار کس کا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے قدیر ہونے کے حوالے سے دیکھیں گے۔ انسان کے لیے تو بس اتنی بات ہی کافی تھی کہ اللہ لیکن وہ جو دشمن ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے وہ جو ہمیں بھلا دیتا ہے کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے

کس کے لئے؟

آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ کیوں آئے ہیں؟ کیا کر کے جانا ہے؟ کیا لے کر جانا ہے؟ کیا منہ دِکھانا ہے؟ کیا کچھ پیش آنا ہے؟ شیطان انسان کو سب کچھ بھلا دیتا ہے اسی لیے یہ Details آتی ہیں ورنہ بات تو اتنی ہی ہے:

اِنَّا لِلّٰهِ

"یقیناً ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں"۔

اوپر ربّ ہے اور نیچے اس کا غلام اور اس کے علاوہ کیا کچھ اُس کی بندگی میں مصروف نہیں ہے؟ ہر چیز غلام ہے۔ آنکھ اٹھاؤ، دیکھو! آسمان غلام ہے، دیکھو! ساری Galaxies غلام ہیں، دیکھو! سارے نظام غلام ہیں، دیکھو! کس کا آرڈر چلتا ہے آسمانوں میں، وہ بڑے بڑے برج جس کے اندر galaxies ہیں۔ وہ ساری galaxies جو کروڑوں اربوں کی تعداد میں ہیں، ہر galaxy کے اندر جتنے سیارے ستارے ہیں، ہر ایک اسی کا غلام ہے۔ وہ جو میرا مولا ہے، وہ جو آپ کا مولا ہے، وہ جو ہم سب کا مولا ہے، وہی آسمانوں اور زمین ہر چیز کا مولا ہے۔ وہی فیصلے کرنے والا ہے۔ ہر چیز اس کی ملکیت ہے۔ آسمان کی ایک ایک چیز پکارتی ہے کہ ہم غلام ہیں، حکم کے پابند ہیں۔ کیسے؟ کوئی چیز اپنے مقام سے ہٹتی نہیں، ہلتی نہیں۔

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین:40)

"ہر کوئی اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے"۔

کس کے حکم سے؟ اُس مولا کے حکم سے۔ اس لیے کہ آسمان اس کے ہیں، آسمان والے اس کے ہیں اور اس آسمان میں چار انگلی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر اللہ کا ذکر کرنے والے، اللہ کی تسبیح بیان کرنے والے نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہیں جھکتے ہوئے پریشانی ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کا بنتے ہوئے تمہارا دل گھٹتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے آگے بچھتے ہوئے

کس کے لئے؟

تکلیف محسوس ہوتی ہے؟ تو آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہاری تکلیفوں کا حل کہاں ہے؟ تم اپنی عقل کی آنکھ کھول لو، بصیرت کی آنکھ کھول کر دیکھو کہ حکمرانی کس کی ہے؟ کنٹرول کس کا ہے؟

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

''جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے''۔

آپ دیکھیں کہ انسان کی آنکھ یا اٹھتی ہے یا جھکتی ہے۔ آنکھ اٹھے تو لِلّٰهِیت کے تحت اور نیچے نظریں کرو تو دیکھو کس کا اختیار ہے؟ نیچے نظریں کر کے کیا دیکھو گے؟ جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ یہ گہرے سمندر، یہ بلند و بالا پہاڑ، یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ درخت، یہ آبشاریں، یہ پودے، یہ پھل، یہ سبزیاں، یہ اجناس، یہ پرندے، یہ جانور، وہ کیڑے جو زمین کے اندر رہتے ہیں، بولو کس کے ہیں؟ وہ ربّ فرماتا ہے:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

''اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہیں''۔

سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کیسے وہ محبت کرنے والا ربّ انسان کے شعور کو غذا دیتا ہے۔ یہ شعور کی سب سے بڑی غذا ہے۔ انسان کی فطرت کی مانگ ہے لِلّٰهِیت۔ انسان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کا یہ تصور دیا۔ کوئی خوشی انسان کو خوش نہیں کر سکتی۔ دنیا کا مال انسان کی ضروریات کو پورا ضرور کرتا ہے لیکن انسان کی فطرت کی Demand کو پورا نہیں کر سکتا۔ دنیا کی ساری نعمتیں، اولاد، والدین، رشتے، محبتیں، وہ سب کچھ جو انسان کو میسر ہے، ہر چیز انسان کے پاس ہو تب بھی ذات کے اندر خلا رہتا ہے۔ انسان کے اندر کا خلاء اس ربّ کریم کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی طرف نظر دوڑانے کے لیے کہا ہے کہ دیکھو! سب کچھ کس کا ہے؟ ہر چیز پر حکمرانی کس کی ہے؟ دیکھو! کس کا قانون چلتا ہے؟ پھر اپنی ذات کے

کس کے لئے؟

لیے فیصلہ کرو۔اب بولو کیا کہتے ہو؟ کس کا قانون چلنا چاہیے؟اپنی ذات کو دیکھو۔اپنی ذات کے اندر للّٰہیت دیکھو!جس وجود کو اپنا کہتے ہو وہ تمہارا کب ہے؟تم کیا تھے؟ کچھ بھی تو نہیں تھے۔پھر تم دیکھنے والے کیسے بن گئے؟ سننے والے، بولنے والے، سمجھنے والے، محسوس کرنے والے کیسے بن گئے؟ وہ ہے وجود دینے والا۔جس نے وجود دیا، وہی وجود کو خالی چھوڑ کر رُوح کا مالک بن جانے والا ہے،رُوح اُس کی مٹھی میں چلی جائے۔پھر بتاؤ اس وجود کا مالک کون ہے؟دل کس کے کہنے سے دھڑکتا ہے؟Blood کس کی مرضی سے circulate کرتا ہے؟انسان کا ذہن کس کے حکم سے کام کرتا ہے؟ آنکھ ہمارے کہنے سے دیکھتی ہے یا اس کے بنائے ہوئے سسٹم کے مطابق؟ کان کیسے سنتے ہیں؟ایک ایک چیز اس کے حکم کی پابند ہے۔

اگر اپنے وجود کے اندر لِلّٰہیت دیکھنا چاہیں تو دل کی دھڑکنیں روک کر دیکھ لیں، دل پکارے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کا ہوں۔اگر آپ stop کر کے دیکھ سکتے ہیں تو اپنی سوچ کو stop کر کے دیکھ لیں۔جو سسٹم اللہ تعالیٰ نے بنا دیا انسان کہاں تک اسے stop کر سکتا ہے؟ آپ اپنے کانوں کو روک کر دیکھئے کہ یہ نہ سنیں!یہ اپنے مالک کی مانتے ہیں لہٰذا یہ سنیں گے۔ آپ اپنی آنکھوں کو دیکھنے سے روک کر دیکھیں یہ نہیں رکیں گی۔ان کے دیکھنے کے لیے اس نے سسٹم بنا دیا، کیا دیکھیں کیا نہ دیکھیں؟اس کے لیے اس مالک نے اختیار دیا ہے کہ کہیں سے نظر بچا سکتے ہو، کہیں پر نظر لگا سکتے ہو، کہیں کان دھر سکتے ہو، کہیں سے کانوں کی توجہ کسی اور جانب کر سکتے ہو تو کان تمہیں سننے کے لیے دیئے ہیں لیکن حق سنو، آنکھ تمہیں دیکھنے کے لیے دی ہے لیکن حق دیکھو، ذہن تمہیں غور و فکر کرنے کے لیے دیا ہے لیکن حق پر غور و فکر کرو۔ سبق لو اس کائنات سے، ہر چیز جو بے اختیار ہے اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور ہر چیز جو با اختیار ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ شاید میرا ابھی کچھ حصہ ہے۔

بااختیار ہونے کے باوجود مالک ربّ ہی ہے۔موت کے وقت کیسے فیصلہ ہوجاتا ہے!وہ سارا وجود جس کو ہم اپنا وجود کہتے ہیں،جس کو ہم کہتے ہیں کہ'میں ہوں' تو وہ مٹی میں مل جاتا ہے۔زندگی میں اگر اپنی 'میں' یعنی ego کو مٹی میں ملادیں تو انسان کو اللہ تعالیٰ برتر کردیتا ہے،سب سے بلند لیکن انسان سے یہ 'میں' نہیں مرتی۔دو چیزوں میں ہمیشہ tie پڑی رہتی ہے۔انسان کہتا ہے:''میں، میرا، میرا وجود، میری آنکھیں، میرا ذہن، میری اولاد، میرا گھر، میرا مال، میرا سبھی کچھ'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لِلّٰہ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

''اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابند ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کا ہے،اللہ تعالیٰ کا ہوکر رہ سکتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قانون کا پابند بنانا ہے۔ربّ کا مطالبہ ہے اَسْلِمْ فرمانبردار ہوجاؤ،اپنا آپ میرے حوالے کردو۔وجود تو اپنے پاس رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے حوالے کیا کردیں؟اختیار۔جس پہ ہم اپنا اختیار سمجھتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں۔

اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ انسان بھی کائنات کی طرح پابند زندگی گزارے،شترِ بے مہار نہ بن جائے۔انسان اور کائنات میں فرق صرف یہ ہے کہ کائنات بالکل بے اختیار ہے۔اللہ تعالیٰ نے کائنات میں آسمانوں کے لیے،زمین کے لیے کہا تھا:

اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (حم السجدہ:11)

''آجاؤ دونوں خوشی سے یا ناخوشی سے''۔

وہ دونوں وجود میں آگئے اور انسان کے لیے اختیار ہے۔اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ

انسان اپنا اختیار جھکا دے۔یہی کام نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! کائنات میں ایک ایک چیز تمہیں بتائے گی کہ جھکنا کیسے ہے؟لِلہ۔اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔یہ ہے اس کائنات کی اصل حیثیت۔ہر چیز اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ہر چیز نے اپنا آپ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ہماری سپردگی میں تھوڑا سا وقت ہے۔موت کے بعد تو کامل سپردگی ہو جاتی ہے لیکن موت سے پہلے اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ یہ جو تھوڑے سے اختیار کا وقت ہے،اس میں اپنا آپ،اپنا اختیار،اپنا ارادہ میرے حوالے کر دو۔آپ کی نہیں بلکہ میری مرضی۔ انسان کہتا ہے کہ 'میری مرضی'،'میں'،'میرا دل چاہتا ہے'۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:نہیں دیکھو! لِلہ۔اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔انسان کہتا ہے کہ میرے لیے ہے۔میں نے اپنے لیے فلاں کام کر لیا۔میں نے اپنے لیے گھر بنانا ہے،میں نے اپنے لیے کپڑے بنانے ہیں،میں نے اپنے لیے فلاں کام کرنا ہے۔اپنے لیے ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں سب ختم ہو جانے والا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو،اپنے اختیار کو میرے حوالے کر دو،پھر تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔پہلے اللہ تعالیٰ کے لیے کر دو پھر تمہارے لیے ہے اور انسان کے لیے کیا ہے؟ جنت،اللہ تعالیٰ کی رضا اور اطمینان[contentment]۔زندگی کی سب سے بڑی دولت اطمینان اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

اللہ تعالیٰ لِلہ سے کیا احساس دلا رہے ہیں؟ کہ انسان ہر وقت اپنے مالک کا ہے، مالک کی نظر میں ہے۔اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔جو بھی چیز جس کی ہوتی ہے وہ اس پر اختیار رکھتا ہے،اس کی نگہداشت کرتا ہے،اس پر کنٹرول کرتا ہے۔انسان بھی اپنے مالک کی نظروں میں ہے۔انسان کا ہر کام اس کی نگرانی میں طے پاتا ہے۔اس کی نگرانی میں یہ سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔مالک نے ہر پوشیدہ اور ظاہری عمل کا حساب لینا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

"اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے"۔

اللہ تعالیٰ کے لیے کیا کچھ ہے؟ حساب لگانا چاہیں، گننا چاہیں، گن نہیں سکتے۔ اللہ ربّ العزت نے ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (الکھف:109)

"(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجئے کہ اگر سمندر میرے ربّ کی باتیں لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے ربّ کی باتیں ختم نہ ہوں بلکہ اگر اتنی ہی سیاہی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے"۔

گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے، لکھنا چاہیں تو سمندر ختم ہو جائیں، درخت ختم ہو جائیں، زمین کا سارا وہ مواد ختم ہو جائے جس کی وجہ سے لکھنا ممکن ہے لیکن ربّ کی یہ کائنات اتنی وسعت رکھتی ہے کہ لفظوں میں سما نہیں سکتی۔ بات یہاں پر ختم کی کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ

"اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ"۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت (یعنی اگر تم اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا انہیں پوشیدہ رکھو، سب پر مواخذہ ہوگا) نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے یہ چیز سخت حیرانی اور پریشانی کا باعث ہوئی۔ چنانچہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گھٹنوں کے بل گر گئے اور عرض کی: آپ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے اور ہم اس حکم کی کہاں طاقت رکھتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اسی طرح کہنا چاہتے ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے تم سے پہلے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی بلکہ یہ کہو کہ ہم نے سنا اور اطاعت

کی۔ پروردگار! ہم آپ سے اپنے گناہوں کی معافی کے طلبگار ہیں اور آپ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ چنانچہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ جملہ دہرایا اور اس سے ان کی زبانیں تر ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ... یہ آیت نازل فرمائی۔ جب اس پر سب نے گواہی دے دی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے حکم کو منسوخ کر کے یہ آیت **لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا**... نازل فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی طاقت کے مطابق تکلیف دیتا ہے۔ **نیز امام مسلم وغیرہ نے ابن عباس** رضی اللہ عنہ **سے اسی طرح روایت کیا ہے**''۔ (لباب النقول فی اسباب النزول از علامہ سیوطی)

آیت کا یہ حصہ توجہ طلب ہے:

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ ط

''اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ''۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنے دل کی باتیں کب چھپاتا ہے اور کب ظاہر کرتا ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ وہ ساری باتیں ظاہر کر دے؟ انسان جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے، ان کی نظروں میں عزت کا مقام چاہیے ہوتا ہے اور اگر انسان دل کی ساری باتیں لوگوں کے سامنے open کر دے تو اس کی ذرا عزت نہ رہ جائے، وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان لوگوں کی نظروں میں مقام پانے کی کوشش کرے لیکن بہرحال اسے اپنی ذات کی عزت کا احساس ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ذات کی عزت کے احساس ہی کو یہاں base بنایا ہے کہ دیکھو! تمہیں عزت چاہیے تو پھر یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں کیا عزت ہے؟ پھر یہ دیکھو کہ تمہارے اندر کی باتوں کا بھی حساب ہو جانا ہے۔ لہٰذا تم اندر کی باتیں لوگوں سے چھپا کر، ان سے بچ کے تو کر سکتے ہو لیکن رب سے نہیں بچ سکتے۔

ربّ نے ایک مومن کو کھلی کتاب بنا دیا۔ اس کے دل کی گہرائیوں تک یہ حقیقت راسخ کردی کہ مالک سے کچھ چھپ نہیں سکتا کیونکہ وہ عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر ہے، وہ دلوں کے راز جانتا ہے۔ ذَاتُ الصُّدُوْر کہتے ہیں دلوں کی ملکہ کو، دل پر جس خیال کا، جس میلان کا، جس خوف کا، جس خلجان کا، جس خواہش کا غلبہ ہے، ان سب پر اللہ تعالیٰ کا غلبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بدولت دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی ہر بات کو جانتا ہے۔ ہر خیال کو، ہر trend کو۔ اس سے کچھ بھی چھپتا نہیں ہے۔ اَللّٰہُ بَصِیْر اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے۔ وہ ایسا بصیر ہے جس کی نگاہوں سے کچھ بھی اوجھل نہیں ہے اور انسان یہاں سے اپنے آپ کو Satisfy کرتا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب تمہیں پتہ چل گیا کہ تمہارا دل تمہارے اختیار میں بعد میں ہے، میرے نوٹس میں تمہارے دل کی باتیں پہلے آتی ہیں۔ جب ریکارڈ ہے، جب اس نے جان لیا تو وہ حساب لے گا۔

اس آیت کے توسط سے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ حساب لے گا۔ جاننے کی بات براہِ راست نہیں ہے لیکن واضح ہے۔ جو دلوں میں ہے، جو ظاہر ہے، ہر چیز کو ربّ جانتا ہے اس لیے اس کا حساب لے گا۔ آپ دیکھئے دل کی بات کسی پہ انسان open کرنا چاہے نہیں کھلتی۔ ماں نہیں جانتی، شوہر نہیں جان سکتا، بیوی نہیں جان سکتی، بہن بھائی نہیں جان سکتے، محبت کرنے والے نہیں جان سکتے۔ کسی کے دل میں کیا ہے؟ کوئی نہیں جان سکتا۔ یا انسان خود جانتا ہے یا ربّ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ کیسا تعلق، کیسا رشتہ بتایا ہے کہ دیکھو! یا تم خود اپنے بارے میں جانتے ہو یا میں۔ کیا ایسا گہرا رشتہ ہم کہیں قائم کرسکتے ہیں؟ کہیں اور یہ رشتہ بن سکتا ہے؟ اس رشتے کو انسان دنیا میں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو میرے دل میں ہے میرے بتائے بغیر دوسرے کو پتہ لگ جائے۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ دوسرے فرد کو انسان زبان سے نہیں کہنا چاہتا،

کس کے لئے؟

دل یہ چاہتا ہے کہ اسے ویسے ہی پتہ لگ جائے۔ اسے کہاں سے پتہ چل جائے؟ نہیں پتہ چلتا۔ اختیار نہیں ہے، دل تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی رسائی ہے، اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو رشتہ میرا اور آپ کا ہے، وہ کسی اور کا نہیں ہے۔ اصل رشتہ بندے اور ربّ کا رشتہ ہے۔ جب کچھ ظاہر کرو تو اپنے ربّ کو یاد کر لو، جب کچھ چھپاؤ تو ربّ کو یاد کر لو۔ یہ رشتہ ہے یادوں کا۔ رب کو اپنی یادوں میں بسانے والا ہی دل کے چھپے ہوئے معاملے پر alert ہو جاتا ہے۔ جس کی یادوں میں ربّ نہیں ہے وہ چھپے ہوئے معاملات کے بارے میں Conscious نہیں ہوتا۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ

''جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، یہ اللہ تعالیٰ کے نوٹس میں ہے''۔

چھپانے کی بات ایک اور angle سے بھی کرنا چاہتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے سوال کیا: یارسول اللہ ﷺ! گناہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تیرے دل میں کھٹک جائے''۔ مَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ ، مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ دو باتیں جو مختلف روایات سے ہمیں ملتی ہے۔ ''جو تیرے سینے میں کھٹک پیدا کردے'' اور ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو تم دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے سے گریز کرو اور تنہائی ملے تو کر جاؤ''۔ (صحیح مسلم:6516)

اس سے پتہ لگتا ہے ناں کہ انسان بری باتیں لوگوں سے چھپاتا ہے، اپنی برائیاں ظاہر نہیں کرنا چاہتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو! لوگوں سے چھپ گیا لیکن میرے سامنے تو کھلا ہوا ہے۔ غائب تو تمہارے لیے ہے، میرے لیے تو کچھ بھی پردۂ غیب میں نہیں ہے،

کس کے لئے؟

تمہارے دل کی حالت بھی نہیں۔تم نے اپنا جرم چھپایا،تم نے اپنی غلطی چھپائی،تم نے اپنا گناہ چھپایا،زیادتی چھپائی،تم لوگوں کی نظروں میں اچھے بنے رہے لیکن تم میری نظروں سے گر گئے۔چھپی ہوئی بات ربّ سے نہیں چھپتی۔اگر تم نے اس کو چھپالیا:

یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ

''اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا''۔

انتہائی دہشت ناک آیت ہے جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گھٹنوں کے بل گرادیا کہ دل پر کس کا اختیار ہے؟دل میں تو خیال آتے ہی ہیں۔دل کی دنیا میں تو ایسی ہلچل جاری رہتی ہے۔انسان اس سے بعض اوقات بے حد up set ہوجاتا ہے لیکن انسان کا اپنے دل پر قابو نہیں رہتا۔اگر دل کی باتوں پہ مواخذہ ہوگیا تو پھر کیا کریں گے؟اس کو وہی محسوس کر سکتا ہے جو صاحبِ شعور ہو،جس کے پاس حکمت ہو،علم ہو،فہم ہو کہ میں اپنا دل ربّ سے چھپانا بھی چاہوں یہ دل open ہے کیونکہ اس دل کا مالک وہ ہے۔دل کی کوئی بات اس سے چھپتی نہیں اور دل میں کیا آتا ہے؟طرح طرح کے خیال،بدگمانیاں،وسوسے۔اور کیا آتا ہے؟بغض،کینہ،حسد۔اگر دیکھیں تو جتنے برے اَخلاق ہیں،ان کا منبع و مرکز تو قلب ہے، اسی طرح جتنے اچھے اَخلاق ہیں ان کا منبع و مرکز بھی قلب ہے۔انسان گناہ کرے،دنیا سے چھپ جائے لیکن قلب پہ دھبہ لگ جاتا ہے اور یہ دھبہ ربّ کے نوٹس میں ہے۔دل سیاہ ہو رہا ہے۔کسی کو معلوم نہیں انسان کو خود محسوس ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر تختی محسوس کرتا ہے لیکن کوئی جانے یا نہ جانے حتیٰ کہ انسان خود بھی نہ جانے،ربّ جانتا ہے،ربّ کو معلوم ہے اور اس نے حساب لے لینا ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ ط

''اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپالو اللہ تعالیٰ تم سے اس

کا حساب لے لے گا“۔

تمہارے دل کے اندر کسی کے خلاف نفرت ہے، کسی کے خلاف بغض ہے، انتقام کے جذبات اُبل رہے ہیں، اندر غصہ ہے، برے خیالات ہیں، تمہارے دل کے اندر بے حیائی ہے یا تمہارے دل کے اندر حیا ہے، تم کچھ بھی اپنے ربّ سے نہیں چھپا سکتے۔ دل کھلا ہوا ہے۔ اس وقت بھی ہم اگر اپنے دل کی حالت کا جائزہ لینا چاہیں تو اس کے بارے میں ہم اتنا نہیں جانتے جتنا مالک جانتا ہے۔ پھر اس سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط

”اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا“۔

کس کس کا حساب دیں گے؟ ذرا اپنے ماضی میں تو چلے جایئے۔ کب، کس وقت، کس کا دل دکھایا تھا؟ کس کے بارے میں برا سوچا تھا؟ کیسے کیسے آپ کا دل سیاہ ہوا! کیسے کیسے یہ دل بدل گیا! کیسے دل کے اوپر ایک ایک گناہ کی چھاپ لگتی رہی حتیٰ کہ دل سیاہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ دل کی سیاہیوں کو دیکھتا ہے۔ سیاہ دل اس ذات کے سامنے ہے جو 'اَلنُّوْرُ' ہے، جس کی ذات سے ہر ایک کو روشنی ملتی ہے، جس ذات کی وجہ سے اس دل نے روشن ہونا تھا۔ روشن نہ کیا تو اس دل کے ساتھ ربّ کے سامنے اپنے آپ کو حاضر تو کر کے دیکھئے۔ ربّ العزت فرماتے ہیں:

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ

”اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا“۔

جو سوچا تھا، جو دل میں رکھا تھا، جس نے تمہارے دل کو خراب کر دیا، برباد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر

واقعہ بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت وان تبدوا... کی تلاوت فرمائی اور بہت روئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اس آیت کے اترتے ہی یہی حال صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہوا تھا، وہ سخت غمگین ہو گئے اور کہا کہ دلوں کے مالک تو ہم نہیں، دل کے خیالات پر بھی پکڑے گئے تو یہ تو بڑی مشکل ہے"۔
(تفسیر ابن کثیر 383/1)

یوں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے شعور کی وجہ سے معاملے کی باریکی کو محسوس کرتا ہے اور یہ شعور ہی ہے جس کی وجہ سے انسان اندر سے کانپ اٹھتا ہے۔ ہمیشہ باشعور کو خوف ملتا ہے اور بے شعور کو بے خوفی ملتی ہے۔ باشعور فرد معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اصلاح اسی تصور سے کی ہے کہ میں جو کچھ چھپاتا ہوں، جو کچھ ظاہر کرتا ہوں سب کا حساب اللہ تعالیٰ نے لے لینا ہے۔ ربّ العزت فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ج صلے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق:16)

"ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں، ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔

دل کے اندر ہر وقت bubbling ہوتی ہے۔ ایک دشمن ہے جس سے پیچھا چھوٹ نہیں سکتا۔ اس دل کے اندر وسوسے ڈالنے کے لیے، ذہن بدلنے کے لیے وہ ہمہ وقتی کوششوں میں مصروف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے دل کے اندر جب کبھی کوئی وسوسہ اُبھرتا ہے، ہم ہر اس اُبھرنے والے وسوسے کو جانتے ہیں۔ وسوسے کی وجہ سے دل کی

حالت پہلے والی نہیں رہتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے پانی کی سطح پہ حباب ابھرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سارے وسوسوں کو جانتا ہے۔ رگِ جاں جس سے جسم اور جان کا رشتہ برقرار ہے، اس جان سے زیادہ قریب۔ ہمارے دل کی ہر حالت کو وہ جانتا ہے۔ اس نے یہ فرمایا:

يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ

"اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے لے گا"۔

اس آیت کی دو خاص باتیں ہم نے دیکھیں، توجہ کیجئے گا: جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ہے آسمانوں میں ہے، سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان کو یہ تسلیم کروانا ہے کہ تم بھی اللہ تعالیٰ کے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کی بات کو کھولا ہے کہ دیکھو! تم اندر تک سے ہمارے سامنے کھلے ہوئے ہو۔ ہم تمہارے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یوں اپنی ملکیت کا احساس دلایا ہے۔ یہ احساس دلایا ہے کہ تم کہیں سے بھی کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔ انسان کی فطرت میں معاملات کو چھپانا ہے۔ ظاہری اعمال میں بھی دیکھیں وہ اچھی چیز کو لوگوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے اور بری چیز کو چھپانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے تمہارا کچھ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے، تمہاری ہر چیز میرے سامنے open ہے۔ لوگ اپنی مجلسوں میں بیٹھ کے سرگوشیاں کریں، راتوں کو بیٹھ کر plannings کریں، negative sharings کریں، اندر سے سب کچھ اُبھر کے باہر ہی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجلس کی بات تو چھوڑو، ظاہر کی بات تو چھوڑو، تمہارے دل کے اندر جس وقت وسوسہ اُبھرتا ہے، ہم اس وسوسے کو بھی جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں قانون سازی کی ہے اور اس قانون سازی کے اختتام پر اپنی ملکیت اور اپنے قادرِ مطلق ہونے کا احساس دلایا ہے۔ ایک طرف زمین و آسمان پر ملکیت، دوسری طرف انسان کے دل پر ملکیت، اس طرح ربّ نے انسان کا تعلق اپنی ذات

کے ساتھ جوڑا ہے۔ یہ بڑا مضبوط رشتہ ہے، بڑا خاص رابطہ ہے۔اس میں دو باتیں بہت اہم ہیں: ایک تو اللہ تعالیٰ کا خوف، اور دوسری آسمانوں اور زمین کے مالک کی مغفرت اور رحمت کی اُمید۔ اللہ تعالیٰ نے جس معاشرے کے لیے قانون دیا ہے، اس کے اَخلاق کی تربیت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اور قانون کا خوف دونوں ساتھ ساتھ ہیں کہ دیکھو دل کے اندر تک کے حالات کو وہ جانتا ہے۔ انسان کا اندر تک اس سے کانپ اٹھتا ہے دوسرے یہ کہ اس پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ کا قانون جاری وساری ہے اور تمہیں بھی اللہ تعالیٰ کا قانون قبول کر لینا چاہیے۔ ربّ العزت فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ج وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (الانفال: 24)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول ﷺ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو! اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے‘‘۔

بات ہے acceptance کی اور اس کا لیول low ہوتا رہتا ہے۔ کبھی دل کے اندر قبولیت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، کبھی کمی آتی ہے۔ شیطان اپنا عمل کرتا رہے تو قبولیت میں آہستہ آہستہ کمی آتی ہے۔ بعض اوقات انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا حتیٰ کہ دل کے اندر قبولیت رہتی ہی نہیں تو اللہ تعالیٰ پھر ایمان کی call دیتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو!‘‘

کس کے لئے؟

اللہ تعالیٰ نے آخرت کے محاسبے کا خوف دلایا ہے۔اس کا مقصد انسان کی اصلاح ہے کہ انسان اپنے اندر اور باہر کے معاملات کی اصلاح کر لے۔اگر حساب کتاب کو،محاسبے کو زندگی سے نکال دیا جائے تو نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ گناہ کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کا تصور دلا کر گناہ کرنے کو مشکل بنایا ہے لیکن اس محاسبے کی روح جانتے ہیں کیا ہے؟ ِللہ (اللہ تعالیٰ کے لیے) اور اخلاص کیونکہ اخلاص محاسبے کی رُوح ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محاسبے کا بہت زیادہ خوف رکھتے تھے۔حساب کتاب سے ان کی رُوح کانپ اٹھتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

کوئی سرسبز درخت دیکھتے تو کہتے: ''کاش میں درخت ہی ہوتا کہ عاقبت کے جھگڑوں سے آزاد ہوتا''۔کسی باغ کی طرف گزرتے اور چڑیوں کو چہچہاتے ہوئے دیکھتے تو سرد آہ کھینچ کر فرماتے: ''پرندو! تمہیں مبارک ہو، جہاں چاہتے ہو چرتے چگتے ہو، جس درخت کے سائے میں چاہتے ہو بیٹھ رہتے ہو اور قیامت میں تم سے کوئی حساب کتاب نہ ہوگا، کاش ابوبکر بھی تمہاری ہی طرح ہوتا''۔

ایک بار فرمایا: ''کاش میں سڑک کے کنارے کا ایک درخت ہوتا کہ میرے پاس سے کوئی اونٹ گزرتا اور مجھے اپنے منہ میں رکھ کر چبالیتا، پھر میں مینگنی بن کر نکل جاتا لیکن انسان نہ بنا ہوتا''۔اس لیے کہ حساب کتاب بہت مشکل ہے۔

ایک بار ایک صحابی جن کا نام رافع طائی رضی اللہ عنہ تھا، اس نے آپ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''مجھے کچھ نصیحت کریں۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خدا تم پر برکت ورحمت نازل فرمائے، نمازیں پڑھا کرو، روزے رکھا کرو، زکوٰۃ دو اور حج کرو اور سب سے بڑی نصیحت یہ ہے کہ کبھی حکومت اور امارت قبول نہ کرنا، دنیا میں امیر کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور قیامت کے روز اس سے

کس کے لئے؟

سختی سے حساب لیا جائے گا اور اس کا اعمال نامہ بہت لمبا ہو جائے گا''۔ (خلفائے راشدین)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

ایک بار سورۃ التکویر کی تلاوت کر رہے تھے جب اس آیت پر پہنچے: وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (التکویر:10) ''جب اعمال نامے کھولے جائیں گے''۔ تو بے ہوش ہو کر گر پڑے اور کئی دن تک ایسی حالت رہی کہ لوگ عیادت کو آتے تھے۔ (خلفائے راشدین)

ایک مرتبہ کہنے لگے: ''علی رضی اللہ عنہ! میں تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن مجھے نہ میری نیکیوں کا اجر ملے اور نہ گناہوں کے عوض میری پکڑ ہو، میرے لیے یہی بڑی کامیابی ہے''۔

ایک بار آپ رضی اللہ عنہ کہیں جا رہے تھے، راستے میں سے ایک تنکا اٹھا لیا اور کہا: ''کاش میں بھی خس وخاشاک ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ کیا جاتا، کاش میری ماں مجھے نہ جنتی''۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ:

آپ رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب نماز کا وقت آ جاتا تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا اور چہرے پر زردی چھا جاتی۔ کسی نے کہا: اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: ''اس امانت کی ادائیگی کا وقت ہے جس کو اللہ جل وشانہ نے آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر اتارا تو وہ اس کے تحمل سے عاجز ہو گئے اور میں نے اس کا تحمل کر لیا، اب دیکھنا چاہیے کہ اسے پورے طور پر ادا کر پاتا ہوں یا نہیں؟''

نماز میں جو چیز انسان کو سب سے زیادہ فائدہ دینے والی ہے وہ تلاوت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اشارہ نماز کے دوران قرآنِ حکیم کی تلاوت کی طرف تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خوفِ آخرت کا یہ حال تھا کہ فرماتی تھیں: ''کاش میں ایک درخت ہوتی کہ ہر دم تسبیح کرتی رہتی اور آخرت کا کوئی مطالبہ مجھ سے نہ ہوتا! کاش میں مٹی کا ڈھیلا ہوتی! کاش میں پیدا نہ ہوتی تو اچھا تھا! کاش میں گھاس ہوتی تو اچھا تھا!''

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ:

وفات کا وقت آیا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ گریہ وزاری میں مشغول تھے۔ لوگوں نے انہیں تسلی دی کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، آپ رضی اللہ عنہ کو رونے کی کیا ضرورت؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے نہ موت کی گھبراہٹ ہے نہ دنیا چھوڑنے کا غم، مجھے صرف عذاب وثواب کا خیال ہے''۔ اسی حالت میں رُوح پرواز کر گئی۔

حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ:

آپ رضی اللہ عنہ جو بھی کام کرتے اس کے متعلق آپ رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ لگا رہتا کہ کل خدا کے سامنے اس کا حساب دینا ہوگا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''قیامت کے ہولناک مناظر سے جی گھبراتا ہے، خدا کے حضور پیشی کا خیال آتا ہے تو طبیعت بے چین اور دل غمگین ہو جاتا ہے، کیا معلوم جنت کی طرف جانا ہو، یا آتشِ دوزخ کی طرف جانا ہو۔ طالبِ دنیا پر تعجب ہوتا ہے کہ موت اس کے تعاقب میں ہے اور وہ دنیا کی امیدوں اور آرزوؤں میں مست ہے، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے یا ناراض لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ وہ پھر بھی قہقہے لگا رہا ہے''۔

ایک موقع پر معززینِ قریش جمع تھے اور اپنے اپنے فضائل ومناقب بیان کر رہے تھے، لوگ منتظر تھے کہ دیکھیں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کیا کہتے ہیں اور اس پیکرِ اخلاص وایثار نے کہا: ''بھائی میں کس بات پر فخر کروں، انجام کی جانب نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے ایک دن یہ جسم گلی سڑی بدبودار لاش کی شکل اختیار کر لے گا، پھر اس کے بعد زندگی کے

کس کے لئے؟

سارے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے۔ اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سرخرو کیا ورنہ دائمی ذلت وخواری سے سابقہ ہے''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی آخری بیماری میں موت کو یاد کر کے بہت روتے تھے۔ لوگ رونے کا سبب پوچھتے تو فرماتے: ''میں اس دنیا کی دلفریبیوں کے چھوٹنے پر نہیں روتا بلکہ سفرِ آخرت کی طوالت اور زادِ راہ کی قلت پر آنسو بہاتا ہوں۔ میں اس وقت دوزخ جنت کے نشیب وفراز کے درمیان ہوں، معلوم نہیں ان میں سے کس راستے پر جانا ہوگا''؟

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ:

آپ رضی اللہ عنہ کے اندیشۂ آخرت کا یہ حال تھا کہ فرماتے: ''اگر مجھے دوزخ وجنت کے متعلق اختیار دے دیا جائے کہ ان میں سے اپنے لیے جس کو چاہو پسند کرلو، یا راکھ ہو جاؤ تو میں راکھ ہو جانا پسند کروں گا تاکہ مجھ سے میرے اعمال کے متعلق کچھ جواب وسوال نہ ہو۔ آخرت کے خوف سے اکثر کہا کرتے تھے: کاش ہم گھاس ہوتے''۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار ایک شخص آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا اور کہا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پاس دو غلام ہیں اور دونوں مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور نافرمانی سے پیش آتے ہیں، اس لیے میں بھی انہیں گالیاں دیتا ہوں اور مارتا پیٹتا ہوں، میرے اس برتاؤ کی وجہ سے قیامت کے روز میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا''؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''تیرے غلام جو تیری خیانت ونافرمانی کرتے ہیں اور تجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، ان کا اور اس سزا کا حساب کیا جائے گا جو تو ان کو دیتا ہے۔ اگر

تیری سزا ان کی خطاؤں سے زیادہ ہوئی تو ان کے حق میں تجھ سے ان کے ساتھ کی گئی زیادتی کا بدلہ لیا جائے گا۔

حضور ﷺ کا یہ ارشاد سن کر وہ شخص ایک طرف ہو گیا اور رونے چلانے لگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھا ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط
وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ
(الانبیاء: 47)

''اور ہم قیامت کے روز انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے، پھر کسی نفس کے ساتھ ذرہ بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا اچھا یا برا عمل ہوگا) تو ہم اس کو لے آئیں گے اور ہم حساب لینے کو کافی ہیں''۔

یہ سن کر اس شخص نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اپنے اور ان غلاموں کے حق میں اس سے بہتر صورت نہیں پاتا کہ ان سے علیحدگی اختیار کرلوں، اس لیے آپ ﷺ گواہ رہیں کہ آج سے میرے غلام آزاد ہیں''۔ (مشکوۃ)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط فَيَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (284)

''تم اپنے دل کی بات کو ظاہر کرو گے یا اسے چھپا لو گے اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے لے گا، پھر جس کو چاہے معاف کردے اور جس کے لیے چاہے عذاب دے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

ربّ العزت فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ ط وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (الانفال:29)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کسوٹی بہم پہنچا دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دے گا اور تمہارے قصور معاف کرے گا، اللہ تعالیٰ بڑا فضل فرمانے والا ہے''۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور قصوروں کی معافی کا پیمانہ پتہ چلتا ہے۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم خدا خوفی اختیار کرو گے، اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اچھائی اور برائی کی شناخت بھی دے دے گا، تمہاری برائیوں کو بھی تم سے دور کرے گا، تمہارے قصور بھی معاف کرے گا۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا ورنہ یہ اعمال کا صلہ نہیں ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کا خوف اتنی بھاری چیز ہے کہ اس کی وجہ سے گناہ معاف ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے مغفرت ہوتی ہے، اس کی وجہ سے معاملات کی اصلاح ہوتی ہے۔

عَنْ حَنْظَلَةَ الْاُسَیْدِیِّ قَالَ :وَکَانَ مِنْ کُتَّابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ : لَقِیَنِیْ اَبُوْ بَکْرٍ رضی اللہ عنہ فَقَالَ: کَیْفَ اَنْتَ یَا حَنْظَلَةُ ! قَالَ : قُلْتُ : نَافَقَ حَنْظَلَةُ قَالَ : سُبْحَانَ اللهِ مَا تَقُوْلُ ؟ قَالَ قُلْتُ :نَکُوْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ یُذَکِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ (حَتّٰی) کَاَنَّا رَاْیَ عَیْنٍ فَاِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ عَافَسْنَا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ وَالضَّیْعَاتِ نَسِیْنَا کَثِیْرًا قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ رضی اللہ عنہ : فَوَ اللهِ ! اِنَّا نَلْقیٰ مِثْلَ هٰذَا فَانْطَلَقْتُ وَاَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ حَتّٰی دَخَلْنَا عَلیٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ :وَمَا ذَاکَ ؟ قُلْتُ : یَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ ! نَکُوْنُ

عِنۡدَکَ تُذَکِّرُنَا بِالۡجَنَّةِ وَالنَّارِ (حتّٰی) کَاَنَّا رَاۡیَ عَیۡنٍ فَاِذَا خَرَجۡنَا مِنۡ عِنۡدِکَ عَافَسۡنَا الۡاَزۡوَاجَ وَالۡاَوۡلَادَ وَالضَّیۡعَاتِ۔ نَسِیۡنَا کَثِیۡرًا۔ فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِہٖ! اِنۡ لَوۡ تَدُوۡمُوۡنَ عَلٰی مَا تَکُوۡنُوۡنَ عِنۡدِیۡ وَفِی الذِّکۡرِ لَصَافَحَتۡکُمُ الۡمَلَائِکَةُ عَلٰی فُرُشِکُمۡ وَفِیۡ طُرُقِکُمۡ وَلٰکِنۡ یَا حَنۡظَلَةُ! سَاعَةً وَّسَاعَةً ثَلَاثَ مِرَارٍ.

حضرت حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اوروہ رسول اللہ ﷺ کے کاتبوں میں سے تھے۔وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا: ’’اے حنظلہ رضی اللہ عنہ! تم کیسے ہو‘‘؟ میں نے کہا: ’’حنظلہ تو منافق ہوگیا‘‘۔ انہوں نے کہا: ’’سبحان اللہ! تم کیا کہہ رہے ہو‘‘؟ میں نے کہا: ’’ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ ﷺ ہمیں جنت ودوزخ کی یاددلاتے رہتے ہیں، گویا کہ ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے نکل جاتے ہیں تو ہم بیویوں اوراولادوں، زمینوں وغیرہ کے معاملات میں مشغول ہوجاتے ہیں‘‘۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’اللہ کی قسم! ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آتا ہے‘‘۔ میں اورابوبکر رضی اللہ عنہ چلے یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! حنظلہ تو منافق ہوگیا‘‘۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’کیا وجہ ہے؟‘‘ میں نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں تو آپ ﷺ ہمیں جنت ودوزخ کی یاددلاتے رہتے ہیں

یہاں تک کہ وہ ہمارے لیے آنکھوں دیکھے ہوجاتے ہیں۔ جب ہم آپ ﷺ کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو ہم اپنی بیویوں، اولاد اور زمین کے معاملات وغیرہ میں مشغول ہوجانے کی وجہ سے بہت ساری چیزوں کو بھول جاتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم اسی کیفیت پر ہمیشہ رہو جس حالت میں میرے پاس ہوتے ہوئے ذکر میں مشغول ہوتے ہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر تم سے مصافحہ کریں اور راستوں میں بھی لیکن اے حنظلہ! ایک ساعت (یاد کی) ہوتی ہے اور دوسری (غفلت کی)۔ آپ ﷺ نے تین بار فرمایا۔ (صحیح مسلم: 6966)

مراد یہ ہے کہ کوئی گھڑی ربّ کی محفل کی ہوتی ہے، وہاں خدا کی یاد ملتی ہے اور کوئی گھڑی غفلت کی ہوتی ہے تو اب دیکھ لیجئے کہ محبت، غفلت کے وقت سے ہے یا جہاں ربّ یاد رہتا ہے؟ انسان کو کتنا مشکل لگتا ہے یادوں میں وقت گزارنا! اور کتنا آسان لگتا ہے غفلت کا وقت گزارنا! شروع شروع میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ تعلق بنتا ہے تو وقت لگانا بڑا بھاری لگتا ہے حالانکہ یہی وقت تو قیمتی ہے۔ یہ wealth ہے۔ یہ وقت آپ نہیں دے رہے، آپ نہیں لگا رہے اللہ تعالیٰ آپ کو دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ موقع دے رہا ہے اور آپ اپنا حصہ لے رہے ہیں۔ غفلت کے وقت میں سے آپ نے یہ وقت بچایا ہے لہٰذا آپ کبھی یہ نہ سوچا کریں کہ ہم نے اتنا وقت پڑھنے کے لیے لگایا، آپ ہمیشہ یہ سوچا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا یہ وقت بچادیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں موقع دیا اور ہم نے اتنا وقت ربّ کو یاد کرتے ہوئے گزار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کتنے تھوڑے وقت میں سے موقع دیا! الحمدللہ۔ یہ اتنا وقت پوری زندگی پہ پھیلنا چاہیے۔ جب یاد نہیں ہوتی، مجلس ختم ہوجاتی ہے تو انسان پر غفلت اپنا

قبضہ کر لیتی ہے اوراس طرح انسان غافل ہوتا چلا جاتا ہے۔

اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کیجئے گا کہ آخر مجھے غفلت سے محبت کیوں ہے؟ اللہ تعالیٰ کی یاد سے وہ محبت کیوں نہیں ہے؟ جانتے ہیں ایسا کیوں ہے؟ ابھی انجام کو آنکھوں کے سامنے دیکھتے نہیں ہیں، ابھی پتہ نہیں چلا کہ کیا چیز قیمتی ہے؟ ابھی یوں ہی لگتا ہے کہ جیسے ہم نے کوئی احسان کیا۔ ربّ پر کیا احسان؟ آپ پوری زندگی غافل رہ لیں یا پوری زندگی ربّ کے لیے لگا دیں، ربّ کو تو ہمارے وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نہ ہوں گے ہمارے جیسی کروڑوں مخلوقات ربّ پیدا کر سکتا ہے۔ جو ہماری ضرورت ہے اس کے لیے احسان نہ جتلایا کریں کہ ہم وقت لگا رہے ہیں۔ اپنا فائدہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت ہماری ضرورت ہے۔ یہ وقت قیمتی ہے، اس وقت پر رحمتیں نازل ہوتی ہیں، دل پگھلتا ہے، ربّ کا تعلق ملتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ یا اللہ! میری آنکھوں کو زیادہ سے زیادہ توفیق دینا کہ تیری کتاب دیکھ لیں، میرے کانوں کو توفیق دینا کہ تیرے کلام کو سن لیں، میرے ذہن کو توفیق دینا کہ ان باتوں کو سوچ سکے تا کہ زیادہ سے زیادہ وقت غفلت سے بچا جا سکے کیونکہ انسان جب غور وفکر نہیں کرتا تو اس کا ذہن شعوری حالت سے بے شعوری حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے، اسی کو غفلت کہتے ہیں۔ جیسے نیند سے پہلے کی کیفیت ہوتی ہے، انسان کو اردگرد کے لوگوں کی آوازیں سنائی دینا ختم ہو جاتی ہیں، وہ اس وقت اپنے اردگرد ماحول کے بارے میں بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ بے خبری اور باخبری میں بنیادی فرق ہے۔ باخبر ہونے کے وقت کو اپنے لیے سب سے قیمتی وقت سمجھیں۔ سوچیں گے، غور وفکر کریں گے تو دل چاہے گا سارا ہی وقت لگا دیں لیکن ممکن نہیں ہوگا، عملاً ممکن نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات انسان نعمت کی ناقدری کر رہا ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موقع دے لیکن ناشکرے انسان کے لئے مواقع ختم ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ

ہمیں یہ مواقع زندگی بھر دیئے رکھے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ : جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم فَسَأَلُوْهُ : اِنَّا نَجِدُ فِيْ أَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهِ قَالَ : أَوَ قَدْ وَجَدْتُّمُوْهُ ؟ قَالُوْا : نَعَمْ . قَالَ : ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ .

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کبھی کبھی تو ہمارے دل میں ایسے وسوسے اٹھتے ہیں کہ زبان سے ان کا بیان کرنا بھی ہم پر گراں گزرتا ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا واقعی تم اسی طرح پاتے ہو (یعنی گناہ سمجھتے ہو)''؟ انہوں نے عرض کیا: ''جی ہاں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ صریح ایمان ہے''۔ (صحیح مسلم:340)

عَنْ صَفْوَانَ بْنِ مُحْرِزٍ قَالَ : قَالَ رَجُلٌ لِّابْنِ عُمَرَ رضي الله عنه : كَيْفَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ فِي النَّجْوٰى ؟ قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ : يُدْنَى الْمُؤْمِنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ رَبِّهِ (عَزَّ وَجَلَّ) حَتّٰى يَضَعَ عَلَيْهِ كَنَفَهُ فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوْبِهِ فَيَقُوْلُ : هَلْ تَعْرِفُ ؟ فَيَقُوْلُ : (أَيْ) رَبِّ ! أَعْرِفُ قَالَ : فَإِنِّيْ قَدْ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَإِنِّيْ أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ فَيُعْطٰى صَحِيْفَةَ حَسَنَاتِهِ وَأَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنٰفِقُوْنَ فَيُنَادٰى بِهِمْ عَلٰى رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ : هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ .

حضرت صفوان بن محرز رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''آپ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے سرگوشی کے متعلق کیا سنا ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''قیامت کے دن ایک مؤمن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے گا۔ پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کروایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو (گناہوں کو) جانتا ہے؟ وہ عرض کرے گا: اے ربّ! میں جانتا ہوں (اقرار کرتا ہوں)۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دنیا میں بھی میں نے تیرے ان گناہوں کی پردہ پوشی کی اور اب آج کے دن بھی میں ان تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہوں۔ پھر اسے اس کی نیکیوں کا اعمالنامہ دیا جائے گا اور کفار و منافقین کو علی الاعلان لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا اور پکارا جائے گا کہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا''۔
(صحیح مسلم:7015)

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایمان کی وجہ سے مومن کی کیسے قدر کریں گے! اصل چیز جو قابلِ قدر ہے وہ انسان کا یقین ہے، ربّ کے ساتھ یادوں بھرا تعلق ہے، ایسا تعلق جو کبھی چھوٹتا نہیں، جو کبھی ٹوٹتا نہیں۔ اسی تعلق کی وجہ سے کل اللہ تعالیٰ رسوائی سے بچائیں گے، اسی تعلق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آج رسوائیوں سے بچاتے ہیں۔

عَنْ اَبِی عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْمَعَافِرِیِّ ثُمَّ الْحُبُلِیِّ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنَ الْعَاصِ ﷺ يَقُوْلُ : اِنَّ اللّٰهَ سَيُخَلِّصُ رَجُلًا مِّنْ اُمَّتِیْ عَلٰی رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَنْشُرُ عَلَيْهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ سِجِلًّا ، كُلُّ سِجِلٍّ مِّثْلُ مَدِّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَقُوْلُ : اَتُنْكِرُ مِنْ هٰذَا شَيْئًا ؟ اَظَلَمَكَ كَتَبَتِی الْحَافِظُوْنَ ؟ يَقُوْلُ : لَا ، يَا

رَبِّ ! فَیَقُولُ : أَفَلَکَ عُذْرٌ ؟ فَیَقُولُ : لَا یَا رَبِّ ! فَیَقُولُ بَلٰی ، اِنَّ لَکَ عِنْدَنَا حَسَنَةً فَاِنَّهُ لَا ظُلْمَ عَلَیْکَ الْیَوْمَ فَیُخْرَجُ بِطَاقَةٌ فِیْهَآ أَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ ، فَیَقُوْلُ : أُحْضُرْ وَزْنَکَ ، فَیَقُوْلُ : یَا رَبِّ ! مَا هٰذِهِ الْبِطَاقَةُ مَعَ هٰذِهِ السِّجِلَّاتُ فِیْ کِفَّةٍ وَّالْبِطَاقَةُ فِیْ کِفَّةٍ فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ ، وَلَا یَثْقُلُ مَعَ اسْمِ اللّٰهِ شَیْءٌ . (ترمذی:2639)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ میری اُمّت کے ایک آدمی کو قیامت کے دن تمام مخلوقات کے سامنے الگ کرے گا۔ پھر اس کے اعمال نامہ کے ننانوے صحیفے پھیلائے جائیں گے۔ ہر صحیفہ انتہائے نظر تک ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو اس سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ کیا میرے مقرر کیے ہوئے کراماً کاتبین نے تجھ پر کوئی ظلم کیا ہے؟ وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے، اور آج کے دن تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا، چنانچہ ایک ورق نکالا جائے گا جس میں لکھا ہوگا: پس میں گواہی دیتا ہوں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اپنے ترازو کے پاس حاضر ہو۔ وہ کہے گا: میرے ربّ! اس ورق کی اتنے بڑے صحیفوں کے سامنے کیا حیثیت ہے؟

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:
''اس کے صحیفوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور اس ورق کو ترازو کے
دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو صحیفوں والا پلڑا اٹھ جائے گا اور ورق
والا پلڑا بوجھل ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کے نام سے کوئی چیز بھاری نہیں ہوگی''۔

اس سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گواہی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی گواہی
بھاری ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں سچ کا وزن ہے، جھوٹ کا کوئی وزن نہیں ہے
بھلے سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا جھوٹا اقرار ہی کیوں نہ ہو۔ اقبال کہتا ہے:

؎ لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

یعنی یہ تو اجنبی زبان کے الفاظ ہیں جب تک دل کی گواہی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ دل کے
اندر تک اتری ہوئی سچائی اگر موجود ہوگی، اس کی گواہی آئے گی، وہ گواہی تحریر ہوگی تو وہ
ورق گناہوں پر مبنی اوراق سے بھاری ہو جائے گا۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيمَا يَرْوِي عَنْ رَبِّهِ
عَزَّ وَجَلَّ قَالَ: "إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ
بَيَّنَ ذٰلِكَ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَمَنْ يَّعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ
حَسَنَةً كَامِلَةً، فَإِنْ هَمَّ بِهَا وَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ
حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ وَمَنْ هَمَّ
بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَإِنْ هُوَ
هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَّاحِدَةً. (صحیح بخاری: 6491)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک
حدیثِ قدسی میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں مقدر کر دی ہیں

اور پھر انہیں صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ پس جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کر سکا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک مکمل نیکی کا بدلہ لکھا ہے اور اگر اس نے ارادہ کے بعد اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اپنے یہاں دس گنا سے سات سو گنا تک نیکیاں لکھی ہیں اور اس سے بھی بڑھا کر اور جس نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اپنے یہاں ایک نیکی لکھی ہے اور اگر اس نے ارادہ کے بعد اس پر عمل بھی کر لیا تو اپنے یہاں اس کے لیے ایک برائی لکھی ہے''۔

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے ارادے پر اس کو اجر ملنے والا ہے، اچھے ارادے پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ہے لیکن اگر برا ارادہ کر لیا اور انسان وہ برا کام کرنے سے رُک گیا تو اس پر بھی اجر ہے۔ یعنی اگر اس ارادے پر عمل نہیں کیا تو اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر پائے گا۔

عَنْ نُعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ يَقُولُ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ : " اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهٖ وَعِرْضِهٖ ، وَمَنْ وَّقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَّرْعَىٰ حَوْلَ الْحِمَىٰ ، يُوْشِكُ أَنْ يُّوَاقِعَهُ ، أَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى ، أَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهُ ، أَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ .

(صحیح بخاری:52)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا،

آپ ﷺ فرماتے تھے: ''حلال کھلا ہوا ہے اور حرام بھی کھلا ہوا ہے اور ان دونوں کے درمیان بعض چیزیں شبہ کی ہیں جن کو بہت لوگ نہیں جانتے (کہ حلال ہیں یا حرام)۔ پھر جو کوئی شبہ کی چیزوں سے بھی بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی محفوظ) چراگاہ کے آس پاس اپنے جانوروں کو چرائے۔ قریب ہے کہ کبھی وہ اس چراگاہ کے اندر گھس جائے (اور شاہی مجرم قرار پائے)۔ سن لو! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چراہ گاہ اس کی زمین پر حرام چیزیں ہیں۔ (پس ان سے بچو اور) سن لو! بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہوگا تو سارا بدن درست ہوگا اور جہاں وہ بگڑا سارا بدن بگڑ گیا۔ سن لو! وہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے''۔

اس حدیث سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کے دل کے اندر جو خیالات، وسوسے پیدا ہوتے ہیں اسی سے انسان کی زندگی یا تو بگڑ جاتی ہے یا سنور جاتی ہے۔ اچھے خیالات، اچھے افکار کی وجہ سے ایک انسان کی زندگی سنورتی ہے اور برے افکار، برے خیالات کی وجہ سے انسان برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''لوگ تین قسم کے ہیں: ایک وہ جن کو آخرت کی فکر میں کسبِ معاش سے دلچسپی نہیں۔ دوسرے وہ جو کسبِ دنیا کی وجہ سے آخرت سے غافل ہیں۔ تیسرے وہ جو دونوں میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ فائزین، عابدین (کامیاب عبادت گزار) کے درجہ والے ہیں، دوسری قسم ہالکین (ہلاک ہونے والے) کی ہے۔ تیسری قسم مخاطرین (خطرہ والے) کی ہے کہ احتیاط نہ ہوئی تو ہلاکت کا خطرہ ہے''۔

(تنبیہ الغافلین: 657)

یہ جو تیسری قسم کے لوگ ہیں کہ اِدھر سے آخرت کمالی، اُدھر سے دنیا۔ یہ لوگ خطرے میں ہیں، کوئی پتہ نہیں کس وقت کس طرف کو اُلٹ جائیں۔

عَنْ رَّجُلٍ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ : أَحْسَبُهُ ابْنَ عُمَرَ رضی اللہ عنہ ۔ (وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ) قَالَ : نَسَخَتْهَا الْآيَةُ الَّتِيْ بَعْدَهَا . (صحیح بخاری:4546)

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا، وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے آیت (وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ) کے متعلق بتلایا کہ اس آیت کو اس کے بعد کی آیت (لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا) نے منسوخ کر دیا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : بَيْنَا جِبْرِيْلُ علیہ السلام قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ سَمِعَ نَقِيْضًا مِّنْ فَوْقِهِ فَرَفَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ : هٰذَا بَابٌ مِّنَ السَّمَآءِ فُتِحَ الْيَوْمَ لَمْ يُفْتَحْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ فَقَالَ : هٰذَا مَلَكٌ نَزَلَ إِلَى الْأَرْضِ لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ فَسَلَّمَ وَقَالَ : أَبْشِرْ بِنُوْرَيْنِ أُوْتِيْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِّنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيْتَهُ . (صحیح مسلم:1877)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے درمیان حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اوپر سے ایک آواز سنی تو آپ ﷺ نے اپنا سرِ مبارک اٹھایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: ”یہ آسمان کا دروازہ ہے جسے صرف آج کے دن کھولا گیا ہے، اس سے پہلے کبھی

نہیں کھولا گیا"۔ پھر اس سے ایک فرشتہ اترا، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: "یہ فرشتہ جو زمین کی طرف اُترا ہے، یہ آج سے پہلے کبھی نہیں اُترا"۔ اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: "آپ ﷺ کو ان دو نوروں کی خوشخبری ہو جو آپ ﷺ کو دیئے گئے اور آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے: ایک سورۃ الفاتحہ اور دوسرے سورۃ البقرۃ کی آخری آیات۔ آپ ﷺ ان میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے، آپ ﷺ کو اس کے مطابق دیا جائے گا"۔

یہ آیات بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ آیت 284 کے حوالے سے جو آخری بات ہے وہ یہ کہ:

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ

"اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کہاں ہے؟ آسمانوں میں۔ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے قدیر ہونے کو کیسے محسوس کرسکتا ہے؟ جب انسان آسمانوں میں قدرت تلاش کرے، جب انسان زمین کے اندر اللہ تعالیٰ کے اختیارات کو تلاش کرے، جب انسان اپنے نفس کے اندر دل کے چھپے ہوئے حالات میں اللہ تعالیٰ کو تلاش کرلے تب اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ پھر فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (285) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا

لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ط رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْلَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (286)

''رسول ایمان لایا ہے اس چیز پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کیا گیا اور مومن بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ سب ہی اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اس کے رسولوں میں سے ہم کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ وہ سب کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں اور رتیری ہی طرف ہمارا لوٹنا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں عرش تلے کے خزانے سے دیا گیا ہوں، مجھ سے پہلے کسی نبی کو یہ نہیں دی گئیں''۔ (تفسیر ابن کثیر: 385/1)

مسند میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''سورۂ بقرہ کی ان دونوں آخری آیتوں کو پڑھتے رہا کرو، میں انہیں عرش کے نیچے کے خزانوں سے دیا گیا ہوں''۔ (تفسیر ابن کثیر: 385/1)

ابنِ مردویہ میں ہے کہ ''ہمیں لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئیں ہیں: میں سورۂ بقرہ کی یہ آخری آیتیں عرش کے خزانے تلے دیا گیا ہوں جو نہ میرے سے پہلے کسی کو دی گئیں نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی''۔ (تفسیر ابن کثیر: 385/1)

ابنِ مردویہ میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نہیں جانتا کہ اسلام

کے جاننے والوں میں سے کوئی شخص آیت الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر سو جائے، یہ وہ خزانہ ہے جو تمہارے نبی ﷺ عرش تلے کے خزانہ سے دیے گئے ہیں"۔ (تفسیر ابن کثیر 1/385)

ترمذی میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی جس میں سے دو آیتیں اتار کر سورۂ بقرہ ختم کی۔ جس گھر میں یہ تین راتوں تک پڑھی جائیں شیطان اس کے قریب بھی نہیں جاسکتا"۔ امام ترمذی اسے غریب بتاتے ہیں لیکن حاکم اپنی مستدرک میں اسے صحیح کہتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر 1/385)

ابن مردویہ میں ہے کہ جب حضور ﷺ سورۂ بقرہ کا اختتام اور آیت الکرسی پڑھتے تو ہنس دیتے اور فرماتے: "یہ دونوں رحمٰن کے عرش تلے کا خزانہ ہیں"۔
(تفسیر ابن کثیر 1/385)

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْبَدْرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : " اَلْآیَتَانِ مِنْ آخِرِ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ : مَنْ قَرَأَھُمَا فِیْ لَیْلَۃٍ کَفَتَاہُ " قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ فَلَقِیْتُ أَبَا مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ وَھُوَ یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ ، فَسَأَلْتُہُ فَحَدَّثَنِیْہِ ۔(صحیح بخاری:4008)

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سورۃ بقرہ کی دو آیتیں (امن الرسول سے آخر تک) ایسی ہیں کہ جو شخص رات میں انہیں پڑھ لے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں"۔ عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ پھر میں نے خود ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی، وہ اس وقت بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے، میں نے ان سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو

انہوں نے یہ حدیث مجھ سے بیان کی۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : اِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ لِاُمَّتِی مَا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسَهَا مَا لَمْ یَتَكَلَّمُوْا اَوْ یَعْمَلُوْا بِهٖ . (صحیح مسلم:331)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لوگوں سے جو ان کے نفسوں میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں جب تک کہ ان کا کلام نہ کریں یا جب تک کہ ان پر عمل نہ کریں، معاف کر دیا ہے‘‘۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

’’رسول ایمان لایا ہے اس چیز پر جو اس کے ربّ کی طرف سے اس پر نازل کیا گیا اور مومن بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ سب ہی اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اس کے رسولوں میں سے ہم کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ وہ سب کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں اور رتیری ہی طرف ہمارا لوٹنا ہے‘‘۔

پہلی توجہ طلب بات ہے رسول کے ایمان کی۔ ایمان کس چیز پر ہے؟ رب نے جو کچھ نازل کیا، رسول کے ایمان کے ساتھ یہ شرف ایمان والوں کو بخشا گیا۔ ایمان والوں کا ایمان رسول کے ساتھ لا کر کھڑا کیا گیا۔

کس کے لئے؟

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ

''اور ایمان لانے والے بھی۔''

دوسری بات جو توجہ طلب ہے وہ ہے ایمان کی حقیقت، اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں اور رسولوں پر ایمان کی حقیقت۔ چوتھی چیز رسولوں کے ساتھ ایمان لانے کی کیفیت ہے۔ مومنوں کو رسولوں کے ساتھ کیسا معاملہ اختیار کرنا چاہیے؟ **لا نفرق** ''ہم فرق نہیں کرتے۔'' بلاتعصب سارے رسولوں کو سچا مانیں، بلاتعصب سارے رسولوں کی اچھائیوں کو قبول کریں۔

وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ق ز غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ (285)

بات ہے قول کی۔ قول ہی ہے جو جنت تک لے جائے گا۔ ایک قول کی قیمت جنت بھی ہے اور ایک قول کی قیمت آگ بھی ہے تو دیکھئے گا کس قول کی قیمت جنت ہے؟

وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا

''انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی''۔

آپ کیا کہتے ہیں؟ جب کام پڑے پھر کیا کہتے ہیں؟ ہمارا دل نہیں مانتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کہا ہو کہ بس دل ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَقَالُوۡا ''انہوں نے کہا''۔

قول دل کے اندر کی گھٹن کو بھی نکال دے گا۔ قول کیا ہونا چاہیے؟ کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے، جہاں اللہ کے دین کے لیے صاحبِ امر یعنی معاملات کے نگران کا حکم ہے، تو کیا کہنا ہے؟ '**سمعنا واطعنا**' 'ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی کیونکہ یہ قول کسی انسان کے سامنے اگر کہا جائے تو اس کے لیے نہیں ہوتا، دراصل اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ جب کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے '**سمعنا واطعنا**' کی بات نکلے تو اس قول کے لیے جنت کا بدلہ ہے۔

کس کے لئے؟

اگلی چیز جو توجہ طلب ہے۔ غفرانک ربنا والیک المصیر

اس آیت کے آخری حصے میں یہ تین چیزیں توجہ طلب ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی مغفرت دوسرے ربنا 'اے ہمارے رب!' اور تیسری ہے والیک المصیر 'تیری طرف لوٹ کا جانا ہے'۔ اگر پہلے لفظ اور آخری لفظ میں رابطہ قائم کریں تو آپ کو زندگی کی کہانی پتہ لگ جائے گی۔ امنا اور المصیر۔ دونوں میں کیا رابطہ ہے؟ تعلق کیا ہے؟ ایمان کس لیے ہے؟ کہ لوٹ کر اُسی کی طرف جانا ہے۔ اس لیے اسی پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ایک ایک چیز کی باری باری وضاحت دیکھیں گے:

سب سے پہلا لفظ ہے امنا۔ یہاں پر سورت کا اتنا خوبصورت اختتام ہے۔ نوٹ کیجئے گا کہ آخری رکوع کا پہلا لفظ ہے لِلّٰہ، دوسری آیت کا پہلا لفظ ہے امنا، اور تیسری آیت کا پہلا لفظ ہے لایکلف اللہ یعنی اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا لہٰذا ایمان لانا ہے۔ یہاں ہم امنا کے حوالے سے ایمان کی حقیقت کو دیکھیں گے۔ ایمان سے کیا مراد ہے؟ ایمان سے مراد ہے شعور کی حوالگی۔ جانتے ہیں انسان کے اندر کیا معاملہ ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا حکم آتا ہے اور ذہن کبھی تسلیم نہیں کرتا تو پھسل پھسل جاتا ہے۔ انسان چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاؤں لیکن اس کی عقل جھکنے نہیں دیتی، ذہن جھکنے نہیں دیتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ سمجھتا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ Proper reasoning نہیں ہوتی اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زیادہ Reasoning ہو جاتی ہے یا الٹے انداز میں Reasoning ہو جاتی ہے۔ ایمان بنیادی طور پر شعور کی حوالگی کا نام ہے۔

پھر شعور کو کیسے حوالے کریں؟ ایک چیز ہے جو حوالگی میں ہمیشہ انتہائی آسانی پیدا کرے گی۔ ہر موڑ پر آپ اسے پرکھ کر دیکھ لیں۔ بھوک ہو، پیاس ہو، درد، تکلیف کے ساتھ بیٹھنا ہو، انسان کہیں کسی مقام پر کام کرتے کرتے exhaust ہو جائے، مجبور ہو جائے، کوئی

کام کرنے کو جی نہ چاہے، کچھ کھانے کو جی نہ چاہے، کچھ پہننے کو جی نہ چاہے، کسی شخص کے ساتھ بات کرنے کو جی نہ چاہے، کسی ماحول کے اندر رہنا مشکل ہو جائے، ہر طرف اسے یوں لگے کہ no vacancy کا بورڈ ہے، پھر انسان اپنا شعور ربّ کے حوالے کیسے کرے؟ رکوع کا پہلا لفظ دیکھ لیجئے: لِلّٰہ۔ یہ آپ اپنے آپ کو کہہ کر دیکھئے: ''لِلّٰہ'' دل کے دروازے اس key سے کھل جائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ، کبھی آپ کو تکلیف ہوگی ہی نہیں۔

اسی طرح انسان پھنستا ہے، جگہ جگہ اٹکتا ہے۔ آپ جب اٹک جائیں، مجبور ہو جائیں، پریشان ہو جائیں، وقت نہ لگا پائیں، صلاحیت لگانا مشکل ہو جائے، کہیں بھی کوئی چیز اَپ سیٹ کر دے تو آپ ایک چیز سے بالکل مطمئن ہو جائیں گے، آپ کو ایسا لگے گا جیسے دل کے اندر پھول کھل اُٹھے ہیں، ایسا لگے گا جیسے تپتی ریت پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برس رہی ہے، ایسا لگے گا جیسے آگ بجھ گئی۔ جانتے ہیں اندر کی آگ کون سُلگاتا ہے؟ وسوسوں کی آگ شیطان سُلگاتا ہے۔ شیطان اپنا کام کرتا جاتا ہے اور انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اندر ہی اندر کتنی فائلز corrupt ہو گئیں! ایسے میں ایک لفظ ہے جو میزان میں بھی بہت بھاری ہے، جو آپ کو امن اور سکون کی نوید دے گا، آپ کا شعور اللہ تعالیٰ کے حوالے ہو جائے گا۔ آپ کہہ کر دیکھئے: یہ قول ہے۔

لِلّٰہ

کہاں کہیں؟ جہاں بھی حکم آئے۔ تنہائی میں بھی کہیں، اکیلے بھی، سب کے سامنے بھی کہیں۔ کیا کہیں؟ لِلّٰہ ۔ لِلّٰہ کہنے کا مطلب جانتے ہیں کیا ہے؟ کہ ہم نے اپنا آپ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا۔ اب جو کچھ بھی ہے سب کچھ آپ کے لیے ہے۔ ہم ہیں ہی آپ کے، آپ کی طرف ہم نے لوٹ کر جانا ہے۔ لہٰذا آپ ہی کے حوالے ہے، یوں حوالگی آسان ہو جائے گی۔ لوگ ہمیشہ کہتے ہیں کہ حوالگی کیسے آسان ہو سکتی ہے؟ کیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے اپنے معاملے کواللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا تھا؟ کیسے انبیاء علیہم السلام نے کیا؟ کیسے صالحین نے کیا؟ لِلّٰہ کے ذریعے کیا۔ یہی راستہ ہے جس سے آپ کی زندگی میں تبدیلی آئے گی، لِلّٰہ سے آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ آپ اللہ تعالیٰ کے ہو کر تو دیکھیے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے راستے پر نہ چلا لے پھر کہیے گا، اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو اطمینان نہ دے دے پھر کہیے گا لیکن شرط ہے لِلّٰہ کی۔ آپ کی زندگی میں جو نمایاں feature آپ کی Identification ہے، وہ کیا بن جانی چاہیے؟ لِلّٰہیت۔ بقول شاعر:

ع غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

ایک انسان کی زبان سے بھی لِلّٰہیت کا اظہار ہونا چاہیے۔ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا کیسے کریں؟ آپ کہہ دیں کہ لِلّٰہ، اللہ تعالیٰ کے لیے۔ یہ بات آپ نے کسی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بات کرنا ہے اگرچہ جی بالکل نہیں چاہتا کیونکہ آپ نے اپنا شعور حوالے کرنا ہے اور کسی کا دل نہیں دُکھانا۔ اسی طرح اگر کہیں کسی ماحول میں بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا، اب وہاں خود کو کیسے بٹھائیں؟ ایک ہی سوچ سے ممکن ہے اور وہ ہے لِلّٰہ "اللہ تعالیٰ کے لیے"۔ جب بھی مشکل محسوس ہو اس وقت آپ یہ کہہ کر دیکھیے "لِلّٰہ"۔ اللہ تعالیٰ تو دل کی باتوں کو جانتا ہے لہٰذا دل سے کہیں۔ جب انسان زبان سے دُہراتا ہے تو بعض اوقات اس کی زبان کہتی ہے اور دوسروں کو آواز نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ کو آواز آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کس لیے ہو رہا ہے؟

طالبات کی کلاس کے دوران شیئرنگ

استاذہ:ﷲ کے تصور کو عملی طور پر بھی enjoy کیا کریں۔ مثلاً اس مائیک کو دیکھیں۔ کسی نے اس کا بٹن آن کیا، اس نے ساؤنڈ پیدا کی تو ِﷲ، کوئی اسے دوسروں تک لے کر پہنچا تو ِﷲ، کوئی اسے سامنے رکھتے ہوئے بولے گا تو ِﷲ اور انسان جوں جوں یہ feel کرنے لگتا ہے تو اس کی زندگی میں خوشیاں آتی ہیں کہ واقعی اصل حقیقت تو یہی ہے اور انسان ماحول سے بھی لِلّٰہیت سیکھتا ہے۔

طالبہ 2: جب سارے اسباب ختم ہو جائیں تو لِلّٰہیت کیسے آئے؟

استاذہ: بات یہ ہے کہ جہاں سارے اسباب کی نفی ہو جائے وہاں اللہ تعالیٰ موجود ہوتا ہے۔ آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں لیکن آپ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں۔ دیکھئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ اور جو نہیں ہے اس کے لیے بھی انسان کے شعور کے اندر گنجائش ہے کہ وہ اس کی خواہش کرے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے پاس ایک چیز ہے ہی نہیں آپ اس کو کیسے اللہ تعالیٰ کے حوالے کر سکتے ہیں؟ آپ اسے اللہ تعالیٰ کے حوالے نہیں کر سکتے لیکن آپ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ اللہ! اگر میرے پاس یہ بھی ہو تو میں

تجھے دے ڈالوں۔مثال کے طور پر اگر ایک انسان یہ کہتا ہے کہ ایسی اگر ایک ہزار زندگیاں بھی ہوں تو میں اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کردوں، اس پر نچھاور کردوں۔ اب یہ وہ بات ہے کہ ہے ہی نہیں لیکن اس کی خواہش ہوسکتی ہے۔

جب سارے اسباب ختم ہو جائیں تو پھر للّٰھیت کیسے آئے، مثال دینا چاہتی ہوں: ایک صاحب قید ہوگئے اور قید کی زندگی میں جمعہ کی نماز پڑھنا ممکن نہ رہا۔ظاہر ہے جیل خانوں میں مساجد نہیں ہوتیں اور جمعہ نہیں پڑھایا جاتا۔ ہر جمعہ کونہاتے، غسل کرکے تیار ہوتے، گیٹ کے پاس پہنچتے اورانہیں کہہ دیا جاتا کہ آپ باہر نہیں جاسکتے تو کہتے کہ یااللہ! میں نے تو پوری تیاری کرلی اور میں نے اپنا معاملہ آپ کے حوالے کردیا۔آپ کیا کہتے ہیں کہ جس نے تیاری کی اور جس نے نہیں کی، کیا دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ اب یہ کہ اسباب نہیں ہیں۔ایک انسان خودکواپنے مقام پر حق بجانب سمجھتا ہے کہ میرے پاس جب اس کا سبب ہی نہیں تو کیا ضرورت ہے تیاری کرنے کی جب کرنے کا سبب ہی نہیں ہے؟ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ یہ عزیمت کا راستہ ہے کہ ایک انسان کو پتہ ہے کہ سبب نہیں ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ پر یقین ہے کہ کیا پتہ سبب بن جائے! میں نے کون ساجا کر دیکھا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ سبب بن جائے اور اگر نہیں بھی بنتا تو میرا اجر کون سا ضائع ہوجائے گا؟ نہ میرا غسل کرنا ضائع گیا، نہ میرا کپڑے تبدیل کرنا ضائع گیا، نہ میرا اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ضائع گیا۔

ایسے ہی زندگی میں بہت سارے ایسے معاملات پیش آتے ہیں جہاں پر انسان کو کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا کہ وہ کوئی کام کرسکے لیکن انسے چاہئے کہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرلے، باقی جونہیں ہوسکتا اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

آپ اِللہ کا استعمال کریں گے، yes کہتے جائیں گے اُتنا ہی اِخلاص آئے گا، اندر خالص ہو جائے گا، اندر سے کھوٹ نکل جائے گا۔ اسی طرح آپ جو یہ کہتے ہیں کہ دل مطمئن نہیں ہے تو دل کو ہم مطمئن کر ہی نہیں سکتے۔ دل تو اللہ تعالیٰ کی دو کریم انگلیوں کے درمیان ہے تو ربّ سے ہی دُعا کر لیں کہ

یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ! ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِک

ثبات ربّ نے عطا کرنا ہے بس ہم نے کہنا ہے سمعنا و اطعنا ''ہم نے مان لیا اور ہم نے اطاعت کی''۔

یقین کریں کہ نفسیاتی طور پر بھی اگر آپ دیکھیں کہ قول انسان کو کہاں لے جاتا ہے؟ ایک بار کسی بات پر آپ no کہہ دیں، اب آپ اسے yes کر کے دکھائیں۔ اپنے اندر کا معاملہ ہے، آپ نے ایک بار کہا کہ نہیں میرا یہ کھانے کو جی نہیں چاہتا، اب آپ دیکھیں آپ کو سارے اردگرد والے منا رہے ہیں اور آپ کے اندر بے دلی ہے۔ وہ جو دل کی کیفیت بدلی ہے ناں وہ no سے بدلی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ yes کہتے جاؤ گے، اگلے کام سنورتے جائیں گے۔

طالبہ: چاہے آپ کو Satisfaction ہو یا نہ ہو؟

استاذہ: ہاں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بے شک Satisfaction نہ ہو۔

طالبہ: چاہے آپ کو سمجھ نہ آ رہی ہو؟

استاذہ: چاہے نہ آئے لیکن مولا کو ہمیشہ 'سمعنا و اطعنا' ہی کہنا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کو بھی 'سمعنا و اطعنا' اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو systems بنا دیئے ہیں وہاں بھی سمعنا و اطعنا کہنے میں بڑی عافیت ہے۔

اس قول میں اتنی برکت ہے کہ انسان خود بخود سنورتا ہے۔ حوالگی سے ہی تو سارے کام سیدھے ہونے ہوتے ہیں۔ جہاں انسان ربّ کے مقابلے میں اپنا مالک خود بن کے بیٹھ جاتا ہے، پھر خود پریشان ہوتا ہے، پھر اپنا مالک بنا نہیں جاتا کیونکہ نفس سرکش ہوجائے تو اپنا آپ بھی قابو میں نہیں آتا۔ نفس سرکش گھوڑا ہے، اسے لگام ڈالنا پڑتی ہے۔ سب سے پہلے یہ لگام قول سے ڈلتی ہے، پھر عمل سے ڈلتی ہے۔ قول مائنڈ سیٹنگ کرتا ہے۔ اپنی مائنڈ سیٹنگ اپنے قول سے ہوتی ہے۔ اندر سے چاہے آوازیں آرہی ہوں: ''بالکل نہیں''، ''یہ نہیں ہوسکتا''، ''ممکن نہیں''، ''اس کا امکان ہی نہیں''، ''میں بھلا کیسے کرسکتی ہوں''؟ چاہے کچھ ہو، آپ سب کی نفی کریں گے۔ یہی لآ الـہ الا اللہ ۔ یہی اللہ تعالیٰ کی بات پر yes کہنا ہے کہ نہیں کوئی نہیں، صرف ربّ کی مانوں گی اور اندر سے اٹھنے والی ہر آواز میرے لیے طاغوت کی آواز ہے، میں اس آواز پر لبیک نہیں کہوں گی۔

جوں جوں انسان ایمانی طور پر آگے بڑھتا ہے، پھر شیطان اسے دھوکے میں لے آتا ہے، reverse gear لگاتا ہے اور پھر انسان کہتا ہے کہ میرا دل نہیں مانتا۔ بھئی نہیں مانتا تو نہ مانے۔ آخر دل کس کا ہے؟ ربّ کا۔ ٹھیک ہے نہ مانے لیکن للہ یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے کروں گی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے تو اس دل کی ہر بات کو Reject کردوں گی، کچھ بھی نہیں مانوں گی، میں اپنی مخالف بن جاؤں گی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی جو دعائیں ہیں اس سے ہمیں کیا پتہ چلتا ہے؟

اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَکَ اَرْجُوْا فَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَّاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ کُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ (ابوداؤد:5090)

''اے اللہ! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں مجھے میرے نفس کے حوالے

ایک لمحے کے لیے نہ کرنا''۔

یا اللہ! مجھے نفس کا بندہ نہ بنانا کیونکہ انسان یہ چاہے کہ اپنے حالات کی خود اصلاح کرلے، ناممکن ہے۔آپ میرے سارے معاملات کی اصلاح کردیجئے۔آپ کے سوا کوئی میرا معبود نہیں ہے، میرا کوئی مولا نہیں، میرا کوئی مالک نہیں۔آپ میرے حالات کی اصلاح کردیں۔انسان یہ کہتا ہے کہ اندر کا معاملہ کچھ سنورے تو باہر سے کچھ کہوں۔اپنا آپ اپنے قابو میں کب ہے؟ قابو میں نہیں آتا۔اگر خود کہیں گے کہ میں اصلاح کرلوں، پھر اصلاح کبھی نہیں ہوسکتی۔ہم خود بھلا اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ اندر کے حال کی اصلاح اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے۔انسان ارادہ کرتا ہے، کوشش کرتا ہے لیکن توفیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملتی ہے اور یقین کریں انسان ہار جاتا ہے۔اسی لیے تو رسول اللہ ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے:

وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا [ref?]

''ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفسوں کے شر کے مقابلے میں''۔

اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا ہے۔اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا دینا ہے۔ایسی جنگ ہے جس میں انسان کا نفس اس کے مقابلے پہ آکھڑا ہوتا ہے۔جوں جوں آپ آگے جائیں گے، نفس اور سرکش ہوگا کیونکہ وہ نفس نہیں ہے، پیچھے شیطانی قوتیں بھی تو ہیں۔نفس سرکش ہوتا ہے، powerful ہوتا جاتا ہے، جتنا وہ powerful ہو اتنا اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جائیں۔پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق:19)

''سجدہ کرو اور قریب ہوجاؤ''۔

اس طرح عاجزی کے راستے اختیار کریں کیونکہ انسان کے لیے اپنے اندر سے بڑائی

کے احساس کو دور کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان کے لیے جو راستے محمد رسول اللہ ﷺ نے Advise کیے وہ بہت قیمتی ہیں۔ مُردوں کو نہلائیں، یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر دیں، قرآنِ حکیم کی تلاوت کریں، آخرت کو یاد کریں، اپنے نہ ہونے کو یاد کریں۔ اپنے نہ ہونے کا انسان کو بڑا دکھ لاحق ہوتا ہے۔ اگر اس موڑ کو انسان یاد کرے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے۔

ماں باپ سے ہر ایک کو بہت محبت ہوتی ہے لیکن جب دنیا سے چلے جائیں تو یہ محبت دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ میرا اپنے ابا جی کے ساتھ زندگی میں بھی بہت محبت بھرا تعلق تھا، لہٰذا بچپن میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے ساتھ شیئر کیا کرتی تھی اور میری ماں (اللہ تعالیٰ ہمیشہ انہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھیں اور ان کی مشکلات اور مصائب کو دور کریں) ہمیشہ مجھ سے یہ بات کہتی تھیں کہ بیٹا یہ باتیں باپ کے ساتھ کرنے والی نہیں ہوتیں، اس طرح کی باتیں نہ بتایا کرو لیکن ابا جی نے ہمیشہ ہمیں اتنا زیادہ مواقع دیے کہ ہم ہر چیز ان کے سامنے کہتے تھے۔ مجھے جب ان کی یاد آتی ہے تو ان کے لئے بہت دُعا کرتی ہوں لیکن آج ایک عجیب معاملہ میرے ساتھ ہوا کہ ابا جی کا چہرہ میرے ذہن میں آیا اور میں نے یوں سوچنا شروع کیا کہ یہ چہرہ تو ابا جی کا نہیں ہے اور میرے ذہن میں آیا کہ مٹ گیا چہرہ اور مجھے کبھی ایسا feel نہیں ہوتا تھا کہ مٹ گیا لیکن جس وقت میں نے سوچا کہ مٹ گیا اور اب وہ نہیں ہے اور اب کبھی واپسی نہیں ہے تو مجھے بہت ہی اچھا لگا کہ واقعی جب ہم بعض اوقات بہت زیادہ یاد کرنے لگتے ہیں تو وہ چیز بھی ہمیں خراب کرتی ہے۔ اس سے مجھے یہ شعور ملا کہ نہیں یادوں میں رہنے کا حق تو ربّ کا ہے۔ اگر ہم کسی اور کو یہ right دے دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے پھر انسان تکلیف محسوس کرتا ہے۔

دراصل یہ شعوری حوالگی ہے کہ جہاں غلطی ہو، خطا ہو، انسان اس موڑ پر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے اور کہہ دے کہ یا اللہ! یہ تیرا ہی حق تھا، تجھے ہی یاد کرنا چاہیے تھا اور یہ معاملات تیری ہی ذات کے سپرد کرنے چاہئیں، یہ معاملہ بھی تیرے ہی حوالے ہے۔

طالبہ 2: میں یہی بتانا چاہ رہی تھی کہ یہ جو slogan "لِلّٰہ" ہے، یہ مجھے بہت چلاتا ہے الحمدللہ۔ جیسے میں کلاس روم میں آتی ہوں تو مجھے یہ نوٹس بورڈ پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ ہم سب کو ضرور اپنے اپنے گھروں میں یہ لکھ کر لگالینا چاہیے۔

استاذۃ: الحمدللہ۔ ایمان سے مراد ہے شعور کی حوالگی۔ اب آپ دیکھئے ابھی تک ہم بات کر رہے تھے کہ شعور کی حوالگی مشکل ہے یعنی جب انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنے لگتا ہے تو اس کے ذہن میں بہت ساری سوچیں آتی ہیں۔ ایمان صرف لفظوں کا اقرار تھوڑی ہے؟ ایمان تو دراصل اپنے شعور کو، اپنے ذہن کو، اپنی قوتوں، صلاحیتوں کو، اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکانے کا نام ہے۔ ایمان شعور کی حوالگی ہے۔ یعنی انسان اپنی سوچ، اپنی ہر فکر، اپنے ہر خیال کی ڈور اپنے ربّ کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ آسانی بہت ہے، تھما کر دیکھئے ربّ چلائے تو کیا ہی بات ہے! جب خود چلاتے ہیں پھر چلتے نہیں، پھر نفس اتنا اَڑیل ہو جاتا ہے، جیسے اَڑیل گھوڑے ہوتے ہیں، ان کا مالک ان کو مارلے، پیار کرلے، جو کچھ بھی کرلے وہ چلتے نہیں۔ نفس اَڑیل گھوڑے سے زیادہ سرکش ہو جاتا ہے، اسے خود نہیں چلا سکتے، ربّ نے چلانا ہے۔ لہٰذا کتنا آسان ہے! ایمان ہی تو انسان کی فطرت کی مانگ ہے کہ خود نہیں چل سکتے، ربّ نے چلانا ہے۔ لہٰذا معاملہ ربّ کے حوالے کر دیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : كَانَ النَّبِیُّ ﷺ بَارِزًا یَوْمًا لِلنَّاسِ فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ : مَا الْاِیْمَانُ ؟ قَالَ : اَلْاِیْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَبِلِقَآئِهِ وَرَسُوْلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ ۔ (صحیح بخاری:50)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی ﷺ لوگوں میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر ایمان لاؤ، اور اس کے فرشتوں کے وجود پر، اور اس (اللہ تعالیٰ) کی ملاقات کے برحق ہونے پر، اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لاؤ۔‘‘

اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں:

آمَنَ الرَّسُوْلُ

''ایمان لایا رسول''۔

بات ہے رسول کی۔ کہاں رسول کا ایمان! رسول کے دل پر وحی نازل ہوتی ہے، رسول کو جنت، جہنم کا مشاہدہ کروایا جاتا ہے اور یہ دیکھیں کہ رسول کے ایمان کی کیسے کیسے حفاظت کی جاتی ہے! کس طرح اللہ تعالیٰ ایک ایک چیز کے لیے انتظامات کرتے ہیں! پیغام میں تبدیلی نہ آئے، دل کے اوپر اس کے بھرپور اثرات ہوں، پیغام کا ابلاغ پورا پورا ہو اور پیغام کے مطابق عمل ہو۔ رسول کا ایمان اعلیٰ درجے کا ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: رسول نے مان لیا۔ کس چیز کو؟

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ

''جو کچھ اس کے ربّ کی طرف سے اُس پر نازل کیا گیا''۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا نازل کیا گیا؟ کتاب نازل ہوئی۔ کتاب پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ جو حکم کتاب میں آجائے، فوراً اپنے شعور کو جھکا دیں، فوراً اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کریں۔ ہر حکم پر یہ کہنا چاہیے **سمعنا و اطعنا** ''ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا'۔ ہم نے تسلیم کرلیا، کہیں بھی یہ نہ سوچیں کہ میرے دل نے ماننا ہے یا نہیں ماننا؟ اللہ تعالیٰ

منائے گا، اللہ تعالیٰ تیار کرے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے **سمعنا و اطعنا** 'ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا' کہنے کی ضرورت ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ

''اور ایمان لانے والے''۔

مومن بھی ایمان لے آئے۔ یہ کتنا بلند مقام ہے! کہاں رسول کا ایمان اور کہاں ایک عام ایمان والے کا ایمان! لیکن یہ ربّ کی رحمت ہے کہ ایمان والوں کے ایمان کو، جنہوں نے آنکھوں سے دیکھا نہیں، جنہوں نے فرشتوں سے ملاقاتیں نہیں کیں، جنہوں نے وحی کو directly receive نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو لے جا کر رسول کے ایمان کے ساتھ ملا دیا۔

پھر کُلٌّ میں دیکھئے کون کون آ گیا؟ سارے رسول۔ کتنی بڑی بات ہے! ایک برابر ہو گئے سارے رسول، سارے صالحین، صدیقین، انبیاء، شہداء، ہر ایک شعوری طور پر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنے والے ہو جائیں تو ہم بھی اس صف میں آ کے شامل ہو جائیں گے۔

كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

''سب ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر''۔

یہاں ایمان کے حوالے سے چار چیزوں کا تذکرہ ہے۔ باری باری ان چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ پہلی چیز ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ربّ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ربّ مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالق ہے، مالک ہے، معبود ہے اور اس کے مقابلے میں ہم مخلوق

ہیں، مملوک ہیں، مرزوق ہیں اور عابد ہیں، غلام ہیں، اللہ تعالیٰ کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔
اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے ہر موڑ پر، اُس کے دل پر، اُس کے ذہن پر، اُس کے معاملات پر اللہ تعالیٰ ہی کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہے، اللہ تعالیٰ ہی کو فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حق یہ ہے کہ اس جہان کی نگہبانی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کائنات کو تخلیق کرنے اور چلانے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی رازق ہے، وہی نفع دینے والا اور وہی نقصان پہنچانے والا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اس لائق ہے کہ اس کی غلامی کی جائے، وہ حقیقی معبود ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ ہی کو انسان کی زندگی کے ہر موڑ پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

☆ اس جہان کی نگہبانی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

☆ اس کائنات کو تخلیق کرنے اور چلانے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

☆ وہی رازق، وہی نفع دینے والا، وہی نقصان پہچانے والا ہے۔

☆ اطاعت اور بندگی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

☆ دین میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا کیا کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے کھاتا پیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے پہنتا اوڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے سوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے جاگتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے بلاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے جو بھی اسے کرنا پڑے، ہر ایک مقام پر اپنے آپ کو حاضر کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا اُس کے قانون، اُس کی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے کوششیں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم کو عام کرنے کی

کوششیں کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر انسان کی زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر انسان مختلف قسم کی زندگی گزارتا ہے۔انسان ایک اللہ تعالیٰ کے سوا ہر بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔انسان اللہ تعالیٰ کی شریعت کے ماسوا ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، بیڑیاں اتر جاتی ہیں،طوق اتر جاتے ہیں، زنجیریں کٹ جاتی ہیں، ہتھکڑیاں کٹ جاتی ہیں۔دنیا میں رہتے ہوئے انسان بندھا ہوا ہے۔زنجیروں میں، ہتھکڑیوں میں، بیڑیوں میں جکڑا ہوا ایک انسان بالکل قیدی بنا ہوا ہے لیکن جو انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا ہر بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہر بندھن اللہ تعالیٰ کے بندھن کے تحت آتا ہے،اللہ تعالیٰ کے رشتے کے تحت آتا ہے تو اس کی وجہ سے ایک انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کسی کی بات ہو تو مان لیتا ہے ورنہ نہیں مانتا۔دیکھا جائے تو ایک انسان کی پوری زندگی بدل رہی ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے ماسوا، اللہ تعالیٰ کے قانون کے ماسوا دوسروں کی لگائی ہوئی پابندیوں سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔وہ پابندیاں والدین لگائیں، شوہر لگائے، وہ پابندیاں رشتہ دار لگائیں، حکومت لگائے، یا وہ پابندیاں معاشرہ لگائے، کوئی پابندی پابندی نہیں۔ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا ساری پابندیاں کاٹ دیتا ہے۔یہ ایک آزاد انسان ہے، کسی کا غلام نہیں۔ایک ربّ کا غلام کسی کی غلامی قبول نہیں کرتا۔یوں انسان اللہ تعالیٰ کے ماسوا دوسرے انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

حضرت حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ ”آپ نے عمل کی بنیاد کس چیز کو بنایا ہے؟“ فرمایا: ”چار چیزوں کو:

ایک یہ کہ میرا رزق مقرر ہے جو میرے سوا کسی کو نہیں مل سکتا جیسا کہ کسی دوسرے کا رزق مجھے نہیں ملتا، اس بات پر میں نے خوب یقین بٹھالیا ہے۔

دوسری یہ کہ میرے ذمہ کچھ فرائض ہیں جو میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا،

لہٰذا میں ان کی ادائیگی میں مشغول ہوں۔

تیسرے یہ کہ میرا یقین ہے کہ میرا ربّ ہر وقت مجھے دیکھ رہا ہے، لہٰذا میں اس سے حیا رکھتا ہوں۔

چوتھی چیز یہ کہ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس ایک مدت ہے جو چلی جا رہی ہے، لہٰذا میں اس سے بھی پہلے کچھ کر لینا چاہتا ہوں"۔ (تنبیہ الغافلین:658)

انسان رزق کی فکر کرتا ہے اور رزق کے پیچھے وقت لگاتا ہے اور رزق کی وجہ سے محسوس کرتا ہے کہ میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں اس کو چھوڑ کر کچھ اور کام کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے کام کروں، وقت لگاؤں، صلاحیت لگاؤں، محنت کروں تو یہ دیکھئے کہ لائف اسٹائل کیسے تبدیل ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ میرا رازق ہے، میرے سوا کسی کو میرا رزق نہیں مل سکتا، میرا رزق مقرر ہے اور یہ کہ جیسے کسی دوسرے کو میرا رزق نہیں مل سکتا ایسے ہی مجھے بھی کسی کا رزق نہیں مل سکتا۔ اس بات پر میں نے خوب یقین بٹھا لیا ہے۔ آپ دیکھئے یہ کرنے والے کام ہیں، صرف سننے والے اور لکھنے والے نہیں ہیں۔ یہ یقین دل کے اندر بتدریج بیٹھتا ہے، آہستہ آہستہ یہ یقین پختہ ہوتا ہے۔

یہ کون کون سے فرائض ہمارے ذمے ہیں؟ ایک وہ ہیں جو اپنی ذات سے متعلق ہیں اور ایک وہ ہیں جو حقوق و فرائض کے حوالے سے دوسروں سے متعلق ہیں اور ایک وہ ہیں جو دینی معاملات سے متعلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو پھیلانے کی، قائم کرنے کی ذمہ داری ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میرے ذمہ کچھ فرائض ہیں جو میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا، لہٰذا میں ان کے ادائیگی میں مشغول ہوں یعنی میں مسلسل وہ کام کر رہا ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ میں نے ہی کرنا ہیں کسی اور نے نہیں اور اگر کسی اور نے کیے تو اس کا فائدہ مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اس لیے میں نے اپنی دنیا، اپنی آخرت خود بنانا ہے۔

تیسرے یہ کہ میرا یقین ہے کہ میرا ربّ ہر وقت مجھے دیکھ رہا ہے لہٰذا میں اس سے حیا رکھتا ہوں۔ یہ بڑی اہم باتیں ہیں، غور وفکر کرنے والی ہیں، اندر بٹھانے والی ہیں، تنہائیوں میں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چوتھی چیز یہ کہ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس ایک مدت ہے جو چلی جارہی ہے لہٰذا اس سے پہلے کہ یہ وقت گزر جائے میں کچھ کر لینا چاہتا ہوں۔

اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ چار معاملات میں اگر ایک انسان اپنے آپ کو settle کر لے تو کافی حد تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایک تو رزق کے معاملے میں، دوسرے فرائض کے معاملے میں، تیسرے اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے کے حوالے سے اور چوتھے یہ کہ وقت کم ہے، مدت کم ہے اور میں نے اس مدت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان انسان کی زندگی بدل دیتا ہے، اُس کی زندگی میں drastic change آجاتی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے نبی ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بندہ برابر نفل عبادات کے ذریعے سے میرے قریب ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے''۔

آپ دیکھیے اللہ تعالیٰ پر ایمان کی یہ انتہا ہے جہاں بندے اور ربّ کا ارادہ ایک ہو جاتا ہے۔ اقبال کہتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

جب انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنا آپ جھکا دیتا ہے، مٹا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ

بھی اس کی رضا پوری کر دیتا ہے۔ بقول شاعر:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر مرتبہ چاہیے

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

بات یہ ہے کہ مٹانے سے ہی نئے راستے کھلتے ہیں، اُستوار ہوتے ہیں۔ بیج بظاہر مٹ جاتا ہے لیکن اس کے پھول، اس کے پھل، اس کی ہریالی، نئی زندگی ہے۔ ایسے ہی دنیا میں کیا گیا کام آخرت میں پھل پھول لائے گا۔ دنیا نے مٹنا ہے اور آخرت نے پھلنا پھولنا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنا سب کچھ لگانا ہے، یہی ایمان کا تقاضا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں نے اسی طرح سے اپنے آپ کو مٹایا۔ مثلاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش دیکھئے: میرا جی چاہتا ہے کہ میں کل جب میدانِ جنگ میں جاؤں، شہید ہو جاؤں تو میری لاش کا مثلہ کر دیا جائے کہ میرا ناک اور میرے کان اللہ تعالیٰ کی خاطر کاٹ دیے جائیں، میرا وجود پہچانا ہی نہ جائے، میری پہچان ختم ہو جائے۔ لِلّٰهِیت کی پہچان جس کے پاس ہو، اس کے اعضاء کٹ بھی جائیں تو کیا ہے؟ اس کے جسم کے ذرّے ذرّے سے، اس کے خون کا آخری قطرے تک سے اللہ تعالیٰ محسوس ہوگا۔ یہی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ انسان اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ اپنے رشتے، محبتیں، مال، گھربار، کاروبار اور ہر وہ چیز جو انسان کو محبوب ہے۔ اللہ تعالیٰ پر درحقیقت ایسا ایمان چاہیے۔ اس ایمان سے زندگی بدلتی ہے۔ اس ایمان سے انقلاب آتا ہے۔

دوسری چیز ہے:

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

اس کے فرشتوں پر سب ایمان لائے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے کارندے ہیں، اللہ تعالیٰ

کے حکم کے پابند ہیں، کبھی ربّ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ وہ ایسی مخلوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کیا، آنکھوں سے اسے دیکھ نہیں سکتے، اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کام کرنے میں مصروف ہیں۔ جیسے بارشیں لانے کے لیے، ہوائیں چلانے کے لیے، رزق پہنچانے کے لیے، کائنات کا انتظام چلانے کے لیے فرشتے ہیں، ایسے ہی وحی لانے کا فرشتہ، جان نکالنے کے لیے اور ایسے ہی صور پھونکنے کے لیے فرشتہ مقرر ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے فرشتے منکر نکیر قبر میں سوال جواب کرنے کے لیے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے جو جہنم کے داروغے ہوں گے، ایسے ہی وہ فرشتے جو جنت میں اہلِ جنت کا استقبال کریں گے، سب حکم کے پابند ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ انسان جس وقت اپنے اردگرد پھیلی کائنات کو دیکھتا ہے، سورج کو دیکھے، چاند کو دیکھے، تاروں کو دیکھے، مختلف برجوں کو دیکھے، galaxies کو دیکھے، زمین کو دیکھے، اردگرد کی ہر چیز دیکھے لیکن چلانے والے کو نہ دیکھے تو شعور بہت چھوٹا رہ جاتا ہے لیکن فرشتوں پر ایمان کی وجہ سے شعور کو وسعت ملتی ہے کہ یہ کام اس جہان میں کس طرح سے انجام پاتے ہیں؟ فرشتوں پر ایمان کی وجہ سے ایمان والوں کو تسکین ملتی ہے۔ جانتے ہیں کس بات پر؟ کہ فرشتے ایمان والوں کے دوست ہوتے ہیں جو اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ایمان والوں کی ڈھارس بندھاتے ہیں، جو ایمان والوں کی مدد کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حٰمٓ السجدہ:30)

کس کے لئے؟

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا: اللہ ہمارا رب ہے پھر وہ اس پر جم گئے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں یہ کہ خوف نہ کھاؤ، غم نہ کھاؤ اور جنت کی بشارت حاصل کرو''۔

ایک اکیلے انسان کے اردگرد کتنے دوست ہیں! کیا کہتے ہیں؟ جنت کے بارے میں سوچو۔ انسان کبھی غور کرے تو اسے فرشتوں کی مدد محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ برا خیال آتا ہے تو شیطان کی جانب سے، یہ اچھا خیال کہاں سے آتا ہے؟ اس کی پیدائش کے لیے اندر کوئی generator تو نہیں لگا ہوتا۔ پہلے وہ موجود نہیں ہوتا پھر وہ اچانک موجود ہوتا ہے۔ وہ کیسے موجود ہو گیا؟ یہ خیال ڈالنے کے لیے فرشتے مقرر ہیں۔ انسان کے دوست یا تو شیاطین ہو سکتے ہیں یا فرشتے۔ یوں ایک انسان کے شعور کو وسعت ملتی ہے کہ اس کائنات میں اردگرد پھیلے ہوئے بہت سے اور مومنین بھی ہیں۔ مومن فرشتے، اللہ تعالیٰ کی ماننے والے اور یہ نظر تو نہیں آتے لیکن دوست ہیں۔ ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے نیاز رکھا۔ اگر ہم ان کے لیے کچھ کر سکتے ہوتے تو وہ ہمیں نظر بھی آتے۔ فرشتے ہمیں دیکھ سکتے ہیں، ہم انہیں نظر آتے ہیں اس لیے کہ وہ ہمارے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ دوستی تو ہے، تعلق تو ہے۔ نظر نہ آنے والی چیزیں وجود رکھتی ہیں، ویسا نہیں جیسا ہم رکھتے ہیں لیکن بہر حال وجود تو ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ جن چیزوں کا وجود ہے ان کا کوئی نہ کوئی کام بھی ہے۔ فرشتوں کا کیا کام ہے؟ اس کائنات کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق عمل کرنا اور اہلِ ایمان کے دلوں میں اچھے اچھے خیالات ڈالنا۔ دیکھیں فرش والوں کا رشتہ عرش کے قریب رہنے والوں کے ساتھ ربّ نے کیسے جوڑ دیا! کیسے ان فرشتوں کی وجہ سے انسانوں کی مدد ہوتی ہے! فرشتوں پر ایمان لانے کی وجہ سے انسان کو یہ احساس ہوتا

کس کے لئے؟

ہے کہ ربّ پر ایمان لانے میں انسان اور فرشتے دونوں شریک ہیں۔

کُلٌّ آمَنَ بِاللّٰہِ

''سب کے سب ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر''۔

رسول بھی اور عام مومنین بھی۔ انسان اس سے تسکین محسوس کرتا ہے۔ Satisfaction جانتے ہیں، کیا ہوتی ہے؟ کہ یہ فرشتے ہمارے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ غلطیاں ہماری اور غلطیوں پر توبہ فرشتے بھی کرتے رہتے ہیں، استغفار کرتے ہیں کہ یا اللہ! ان سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، انہیں معاف کر دینا! ہر وقت کی سفارش جاری ہے۔ انسان کو یہ یقین آتا ہے کہ ہر نیکی کے کام میں فرشتے معاون اور مددگار ہیں لہٰذا وہ اپنے آپ کو نیکی کا کام کرتے ہوئے تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح فرشتوں پر ایمان ایک ایسے ساتھی کا شعور دیتا ہے، ایک ایسی رفاقت کا شعور دیتا ہے جو ہمہ وقتی نئی رہتی ہے، اس میں نیا پن ہے، تازگی ہے اور پھر ایک ایسا ساتھی ہے جو کبھی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ لطافت ہے اس تعلق میں۔ ہر وقت انسان اس احساس سے خوش ہوتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاون اور مددگار فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کائنات کے بارے میں انسان کا نظریہ سنورتا ہے کہ کائنات کوئی بے روح مشینی ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ ایک زندہ نظام ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبرداروں کے ذریعے چلا رہا ہے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ:

کُلٌّ آمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ

''سب ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر''۔

کیسے انسان کی زندگی کو یہ احساس، یہ تصور، یہ عقیدہ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ انسان کی زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔

کس کے لئے؟

تیسری چیز ہے:

وَكُتُبِهٖ

''اور اس کی کتابوں پر''۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتابوں پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں انسانوں کی ہدایت کے لیے اتاریں۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے والا کتاب کو رحمت [Blessing] سمجھتا ہے۔ ایک ایک حکم پر ایسے لگتا ہے جیسے اس کے اندر سے خوشی کے فوارے پھوٹ نکلے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ کبھی کوئی چیز پانی کی صورت میں زمین کے اندر سے پھوٹتی ہے تو کس طرح اوپر تک پانی چلا جاتا ہے اور کبھی لاوا پھٹتا ہے تو کس طرح اوپر تک چلا جاتا ہے اور پہاڑوں کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی پہلے زمین کے اندر ہی تھے۔ پھر زمین سے لاوا پھوٹا، ٹھنڈا ہوا تو ان کی یہ شکل بن گئی، وہ اپنی اپنی جگہ پر جم گئے۔

کچھ چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں جو وقتی طور پر پھوٹتی ہیں، نکلتی ہیں لیکن پھر ختم لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتیں ہیں جو جڑ پکڑ جاتی ہیں جیسے پہاڑ جڑ پکڑ جاتے ہیں۔ عقیدے کی مثال پہاڑ کی طرح ہے۔ یہ اس طرح دل کے اندر ٹھک جائے، اس طرح جم جائے کہ پھر انسان ہمیشہ اس سے فائدہ حاصل کرتا رہے، ہمیشہ اس یقین کی وجہ سے اس کے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں تو کتاب پر ایمان اتنا گہرا ہونا چاہیے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے انسان بچھ جائے، جھک جائے۔ جانتے ہیں یہ کیسے گہرا ہو سکتا ہے؟ رحمت محسوس کر کے، اس کو اپنے لیے برکت محسوس کر کے، اپنے لیے ضروری خیال کر کے۔ جتنا آپ محسوس کرتے جائیں گے تو کلام پر یقین اور اندر سے پھوٹنے والی خوشی جمنا شروع ہو جائے گی لیکن جمے گی شعور سے۔ شعور کی وجہ سے ایک انسان اس بات پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے

اس سوچ سے ہلا نہیں سکتی کہ واقعی کتاب میری بنیادی ضرورت ہے، یہ کتاب میری راہ نمائی کے لیے ہے، میں نے راہ نمائی اسی سے لینا ہے، یہ میرے حق میں شفیع ہوگی یا میرے خلاف سفارش کردے گی۔ کتاب کے مطابق زندگی گزارنے میں ہی میرے لیے بہتری ہے۔

چوتھی چیز ہے:

وَرُسُلِهٖ

''اور اس کے رسولوں پر''۔

اللہ کے رسولوں پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جن بندوں کو منتخب کیا وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے، سب انسانی راہ نمائی کے لیے آئے، سب کا رول leadership کا تھا، سب اللہ تعالیٰ کے آگے بچھے ہوئے، جھکے ہوئے تھے۔ سب رسولوں کے سلسلے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی کوئی رسول پہلے آتا ہے تو دوسرا اس کی تصدیق کے لیے آتا ہے اور کوئی رسول پہلے آتا ہے تو بعد میں آنے والے کی بشارت دے کر جاتا ہے۔ رسالت کا سلسلہ ایک ہے۔ یہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں۔ اسی وجہ سے ربّ العزت نے فرمایا:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

''ہم رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے''۔

یعنی سارے رسول اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئے، اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی لے کر آئے۔ رسالت پوری انسانی تاریخ میں ہونے والا ایک مسلسل واقعہ ہے، Continuity ہے یعنی رسالت کسی ایک موقع پر ظہور پذیر نہیں ہوئی، رسالت کا تسلسل ہے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ابتداء میں آئے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے

اختتام میں آئے۔ اگر کوئی پہلا نبی ہے اور کوئی آخری تو پہلے اور آخری کے درمیان ایک تعلق ہے۔ اس ایمان کے نتیجے میں اُمّتِ مسلمہ تمام رسولوں کی وارث ہے اور اس زمین پر وہ اس کی محافظ ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ : سَمِعَ عُمَرَ رضی اللہ عنہ يَقُوْلُ عَلَى الْمِنبَرِ : سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ : لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَآ أَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَآ أَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا : عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهٗ .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے میرے مرتبے سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسے عیسٰی ابن مریم علیہ السلام کو نصاریٰ نے ان کے مرتبے سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں، اس لیے یہی کہا کرو (میرے متعلق) کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں“۔ (صحیح بخاری:3445)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اُمّتِ مسلمہ رسولوں سے ملنے والے سرمائے کی محافظ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سرمایہ کیسا ہے؟

یہ ہدایت اور نور کا سرمایہ ہے۔

یہ یقین کا سرمایہ ہے۔

یہ رضائے الٰہی کا سرمایہ ہے۔

یہ علم کا سرمایہ ہے۔

اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر آج رسولوں کی طرف سے ملنے والی ہدایات ہمارے پاس نہیں ہیں تو رسولوں کا دیا ہوا سرمایہ لٹ گیا، آج پوری اُمّت تہی دامن ہے۔

اُس کے پاس یہ سرمایہ موجود نہیں ہے۔اسی وجہ سے زندگی مختلف ہوگئی، زندگی متاثر ہے۔ جانتے ہیں وہ شکوک وشبہات جوآج اُمتِ مسلمہ کے اندر پائے جاتے ہیں کس وجہ سے ہیں؟ ایمانی سرمایہ لٹ گیا، رسولوں کی میراث لٹ گئی اوراگر یہ دیکھنا چاہیں کہ انسانیت کیوں تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے؟ تو دراصل وہ سرمایہ جورسولوں نے دیا تھاوہ لیا نہیں۔ سرمایہ محفوظ ہے، موجود ہے لیکن زندگی کے لیے جولے گا،اس کی زندگی ہی روشن ہوگی۔اگر کتاب الماریوں میں پڑی رہے گی، اگرچہ کتاب تو حق ہے، سچائی بتانے والی ہے تو سچائی کسی کے دل کے اندر نہیں اترے گی۔روشنی سے جوفائدہ اٹھائے گا اسی کو فائدہ ملے گا۔آج اگر دنیا رنج والم میں مبتلا ہے تو اسی وجہ سے کہ رسولوں سے ملنے والے سرمایے کولٹا بیٹھی ہے، کھودیا ہے۔آج اگر بدبختی اور پریشانی سے انسانیت عاجز ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ رسولوں کا دیا ہوا سرمایہ لٹ گیا۔ آج اس میراث کو کھوکر ہم کہاں آن پہنچے ہیں؟ کہ اپنی زندگی میں کوئی راستہ نہیں پاتے کہ کہاں قدم رکھیں اور کہاں نہ رکھیں۔اقبال نے کہا تھا:

وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
انہیں دیکھیں جو یورپ میں تو دِل ہوتا ہے سیپارہ
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارہ
گنوا دی ہم نے جو اُسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جو تباہی، بربادی، ہلاکت اور مغلوبیت کا فیصلہ ہوا، اس میراث کو چھوڑ کر ہوا، جو رسولوں کے توسط سے ملی تھی اور آج بھی اگر انسان کو فضیلت مل سکتی ہے، عظمت نصیب ہوسکتی ہے، انسانیت کو امن مل سکتا ہے، عدل مل سکتا ہے تو رسولوں کی

کس کے لئے؟

میراث پاکر۔ایک چارانگلی زمین کے پیچھے لوگ کٹ مرتے ہیں کہ یہ ہماراورثہ ہے،ہم کیسے چھوڑسکتے ہیں؟تو جو ورثہ دنیاوآخرت میں کام آنے والا ہے اس کو کیسے چھوڑے بیٹھے ہیں؟اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

''ہم رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے''۔

کیونکہ رسولوں کے درمیان فرق کرنے والے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو متعصب انداز میں قبول کرتے ہیں،کسی ایک واسطے سے ملے تو اسے قبول کرتے ہیں اور دوسرے واسطے سے ملے تو اسے قبول نہیں کرتے۔اللہ ربّ العزت نے فرمایا تھا:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (البقرہ:253)

''یہ رسول ہیں،ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی''۔

جو فضیلت اللہ تعالیٰ نے دی وہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔ہم سے اللہ تعالیٰ نے یہی مطالبہ کیا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

''ہم رسولوں میں کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے''۔

سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے،سب ہدایت لے کے آئے،ہم فرق نہیں کرسکتے کہ کون زیادہ مخلص تھا اور کون کم؟ہم اللہ کے رسولوں کو دراصل الگ شمار نہیں کرتے۔یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔رسولوں کا ورثہ ایک ہی تھا اس لیے کہ ہدایت کا منبع ومرکز ایک تھا۔اللہ تعالیٰ کی ذات ہی نے یہ ہدایت پہنچائی۔اب یہ ہدایت رسول اللہ ﷺ کے توسط سے ہمارے پاس آن پہنچی اور آپ ﷺ کی وصیت موجود ہے،خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

کس کے لئے؟

بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

''مجھ سے پہنچادو اگرچہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''؟

اور آپ ﷺ نے سب سے یہ سوال کیا تھا:

اَلا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟

''خبردار! کیا میں نے پہنچادیا''؟

سب نے بیک وقت یک زبان جواب دیا تھا: ہاں آپ نے پہنچادیا۔ اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرا کر جواب دیا تھا:

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ

''یا اللہ! تو گواہ رہنا''۔

تین بار آپ ﷺ نے یہ بات کہی تھی۔ (صحیح مسلم: 2950)

ذرا سوچئے کیا میں یا آپ یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ہم نے سب کچھ پہنچادیا؟ اب رسولوں کے ورثے کو پانے والوں کو دیکھنا چاہیے کہ کہاں تک پہنچایا؟ اپنے گھر والوں کو، اپنے دوستوں کو، تعلق والوں کو، رشتہ داروں کو، اس ملک کے رہنے والوں کو اور پوری دنیا کے اندر بسنے والوں کو کہاں تک پیغام پہنچایا؟ یہ پیغام پہنچانا اتنا بڑا کام ہے کہ اس کو ربّ نے حق کی گواہی قرار دیا ہے۔ یہ شہادتِ حق ہے اور اسی پر محمد رسول اللہ ﷺ سے گواہی لی جائے گی۔ آپ ﷺ نے پہنچایا اور آپ ﷺ کے بعد میں آنے والوں تک پہنچا تو انہوں نے آگے کہاں تک پہنچا؟ جو رسولوں کے مشن کے امین ہیں، جو رسولوں میں فرق نہیں کرتے، اب انہوں نے اس مشن کو لے کر اٹھنا ہے اور پوری دنیا تک پہنچانا ہے اس لیے کہ ربّ العزت نے فرمایا:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ (ال عمران:110)

”تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا۔ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اس لیے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو“۔

ایمان کا تقاضا ہے کہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ”نکالا گیا ہے“۔ کہاں سے؟ پردۂ غیب سے۔ ایک ایک کو پکڑ کر اللہ تعالیٰ سامنے لا رہا ہے کہ آجاؤ! آپ حق کی گواہی دے دو، آپ دے دو، آپ دے دو۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے گھروں سے حق کی گواہی کے لیے نکالا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بات کتنی سچی ہے! اُخْرِجت للناس ۔ اپنے لیے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ نے ”للناس“ پوری انسانیت کے لیے نکالا ہے۔ یہ گواہی جو آپ پروی جارہی ہے، کلام کی گواہی ہے، حق کی گواہی ہے، حق پہنچایا جارہا ہے۔ یہ حق اب آپ نے پوری انسانیت تک پہنچانا ہے انشاءاللہ تعالیٰ۔ پھر فرمایا:

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (285)

”انہوں نے کہا: ہم نے سنا ہم نے اطاعت کی“۔

اطاعت سے مراد عملی حوالگی ہے۔ ایمان والے اللہ تعالیٰ کی بات سنتے ہیں اور ہر حکم مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا قائد بنانے والے اس کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔ فقیہ ؒ فرماتے ہیں کہ ”اطاعت کی بنیاد تین چیزیں ہیں: خوف، اُمید ورجا اور محبت۔ خوف کی علامت حرام کاموں کو ترک کرنا ہے۔ طاعت وفرمانبرداری کی رغبت اُمید ورجا کی علامت ہے۔ ذوق وشوق اور دھیان میں رہنا محبت کی علامت ہے“۔ (تنبیہ الغافلین:656)

یوں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ”اَطَعْنَا“ کی base میں تین چیزیں ہیں، ان کو ضرور پرکھئے۔ خوف، اُمید اور محبت، یہ تین چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اعمال بدلتے ہیں۔ خوف کی وجہ سے انسان حرام کاموں سے بچتا ہے۔ اُمید کی وجہ سے انسان اطاعت اور فرمانبرداری

کرتا ہے اوراس کے مقابلے میں اگر ہم دیکھیں تو محبت کی وجہ سے ایک انسان ذوق وشوق کے دھیان میں لگا رہتا ہے۔ ہر وقت اسے ایک ہی چیز کا دھیان ہے،سوتے، جاگتے، اُٹھتے ، بیٹھتے ، ہر وقت اس کو ایک ہی دھن لگی ہوئی ہے کہ کس طرح لوگوں تک اللہ تعالیٰ کی بات پہنچادوں؟ اس کے لیے میں کیا کیا کر جاؤں؟

غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا

''ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں''۔

اللہ تعالیٰ سے فریاد ہے۔ کسی اور سے نہیں تجھ سے معافی چاہیے۔ کیوں؟ رَبَّنَا اے اللہ! تو ہمارا ربّ ہے، تونے ہمیں پیدا کیا، تونے ہماری پرورش کی، تونے ہمیں اس مقام تک پہنچایا، تونے ہی ہمارے دل کے اندر اچھائی اور برائی کی استطاعت رکھی ۔اے ہمارے ربّ! تو ہمیں معاف فرما۔ یہ وہ شخص کہتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ میرے اندر کوتاہیاں ہیں، غلطیاں ہیں، غُفۡرَانَکَ لیکن جو انسان کہتا ہے کہ 'پھر کیا ہوا'؟ اور جو انسان یہ کہتا ہے کہ 'کوئی بات نہیں ایسا تو ہو ہی جاتا ہے' تو وہ غفرانک کی اسٹیج تک نہیں پہنچتا، مغفرت نہیں مانگتا، استغفار نہیں کرتا۔ غفرانک ربنا کے یہ الفاظ وہ شخص کہتا ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ جو فرائض میرے ذمہ ہیں میں انہیں پورے طریقے سے ادا نہیں کر پاتا۔ جو انسان جان بوجھ کر کوتاہی نہیں کرتا لیکن کمی رہ جاتی ہے، اے اللہ! تو معاف کر دینا، جو کمی ہے اس کو تو ڈھانپ دینا۔ ایسا انسان اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے کہ اے اللہ! تو غلطیوں کو معاف کردے اور اپنی رحمت سے ڈھانپ لے تو اللہ تعالیٰ معاف کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان معافی کا حق دار کب ہوتا ہے؟

جب وہ اللہ تعالیٰ کی بات سنتا ہے۔

جب وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔

جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

اپنا آپ جھکا دیتا ہے۔

جب وہ للٰہیتْ اختیار کرتا ہے۔

اسے یقین آ جاتا ہے۔

وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ

''تیری طرف ہی تو لوٹ کر جانا ہے۔''

جب اسے یقین آتا ہے کہ ہر معاملے کی جواب دہی رب کے سامنے کرنی پڑے گی تو انسان اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتا ہے۔ جب اسے یقین آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہے، اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ جب اسے یقین آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی قوت بچانے والی نہیں ہے تب وہ اللہ تعالیٰ سے معافیاں مانگتا ہے کہ اب کہاں جاؤں؟ بھاگ کر کہاں جاؤں؟ اَیْنَ الْمَفَرّ؟ کہاں ہے کوئی جائے پناہ؟ جب کوئی جائے پناہ نہیں دِکھتی پھر انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتا ہے، معافی مانگتا ہے۔ جب اسے یہ یقین آ جاتا ہے کہ صرف اسی کی مغفرت بچا سکتی ہے تو وہ معافی کا طلب گار رہتا ہے:

غُفْرَانَکَ رَبَّنَا

''اے ہمارے رب! ہم معافی کے طلب گار ہیں''۔

جب ایک انسان سمع و اطاعت اختیار کرتا ہے، لِلّٰہیت اختیار کرتا ہے تو اس کے اندر کا نظام سنورتا ہے، اردگرد کا ماحول سنورتا ہے، تبدیلی آتی ہے اور پوری انسانیت فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایک انسان کا تسلیم کرنا پورے معاشرے کو فائدہ دیتا ہے اور ایک انسان کا تسلیم نہ کرنا ساری انسانیت کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے

کہ دیکھو! اس آسمان میں بھی لِلّٰہیت ہے اور اس زمین میں بھی لِلّٰہیت ہے۔ تم بھی ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے کرو۔

پھر آپ دیکھئے کہ ایک انسان معافی کا حق دار اس وقت قرار پاتا ہے، جس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہے، وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ ۔ جو تیرا نافرمان ہوگا اس کو ہم چھوڑ دیں گے، اس سے تعلق ہی نہیں رکھیں گے، بھلے سے وہ میری ماں ہو، میرا باپ ہو، میرے بہن بھائی ہوں، میرے گھر والے ہوں، کوئی بھی ہو۔ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ ۔ آپ نے کبھی یہ الفاظ اللہ تعالیٰ سے کہے ہیں؟ کبھی نماز کے دوران کہے ہیں؟ اگر کہے ہیں تو شعوری طور پر محسوس نہیں کیا۔ لِلّٰہیت کا تقاضا ہے، مغفرت مانگنا ہے، اللہ تعالیٰ سے کہنا ہے وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ جو تیرا نافرمان ہے ہم اسے چھوڑ دیں گے، اس کو نہیں اپنائیں گے، اس کے پیچھے نہیں چلیں گے تو دیکھئے سمعنا واطعنا کہاں لے آیا؟ غفرانک سے الیک المصیر تک

غُفْرَانَکَ رَبَّنَا

اے ہمارے رب! اے ہمارے پالنے والے! اے رحمتیں کرنے والے! رحمتیں برسا دے، اے گناہوں کو معاف کرنے والے! ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے، ہم سب پر اپنی رحمت کردے، اپنی نظرِ کرم کردے۔

وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ

ایک انسان جب یہ الفاظ کہتا ہے تو دراصل یہ یقین کر لیتا ہے کہ اب میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ پھر وہ یہ جان لیتا ہے کہ مجھے کسی نے پناہ نہیں دینی، وہ یہ جان لیتا ہے کہ کوئی میرے بدلے میں کام نہیں آئے گا، وہ یہ جان لیتا ہے کہ کوئی میری سفارش نہیں کرے گا، مجھے صرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت بچا سکتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتا

ہے، پیشانی رکھ دیتا ہے، ہاتھ اٹھاتا ہے پھر دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ یا اللہ! معاف کر دے، یا اللہ! ہم سے درگزر فرما۔

وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ

''تیری ہی طرف پلٹنا ہے''۔

کسی شاعر نے کہا:

اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

کوئی امید ہو تو اتنا زیادہ منزل سے دور نہیں نکل جاتے، منزل کی طرف رخ کرتے ہیں، اُسی کی طرف رخ کر کے چلتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ پلٹنے کی بات کے انسان کی زندگی پر بڑے اثرات ہوتے ہیں، انسان بے سمت نہیں چلتا، منزل کو نہیں چھوڑتا۔ انسان اپنا راستہ چھوڑتا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا مطیع فرمان ہو جاتا ہے۔ نیکی کے راستے کو تلاش کرتا ہے، اس پہ چلتا ہے۔ انسان کو دنیا میں مشقت ملے یا راحت، فائدہ ہو یا نقصان، وہ کچھ کھو رہا ہو یا کچھ پا رہا ہو، اسے یقین ہوتا ہے کہ اصل جزا آخرت کے دن ملے گی اور وہاں میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پھر اس کے اعضاء کٹیں تو کہتا ہے: فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَة ''ربّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا'' کیونکہ آخرت کی جزاء سزا پر یقین ہوتا ہے۔ انسان کا عزم پختہ ہو جاتا ہے۔ وہ حق کے راستے سے نہیں ہٹتا بھلے سے پوری دنیا مخالف ہو جائے۔ جس کو یہ یقین نہیں ہوتا وہ کہتا ہے کہ سہولت ہو گی تو یہ کام کریں گے، دُعا کریں سہولت ہو جائے اور حق کا راستہ سہولتوں والا ہے نہیں۔ یہ تو مشکلات کا راستہ ہے چاہے مٹھی کھولنے کی بات ہو یا دل کھولنے کی ہو۔ پاؤں کام کریں یا ہاتھ کام کریں، آنکھیں جاگیں، کانوں کو کسی بات کے سننے سے رکنا پڑے یا زبان کو روکنا پڑے، کچھ بھی ہے مشقت ہے، سہولت نہیں ہے۔ لہٰذا جو جزا سزا پر یقین رکھتا ہے وہ مشقتوں کو برداشت کر جاتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی اس خیر یعنی جنت کا طالب ہوگا وہ خوب محنت کرے گا، لاغر ہو جائے گا اور مسلسل استقامت دکھائے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے آ ملے گا۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حم السجدہ:30)

''جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور اس کے تقاضوں پر پابندی اختیار کی''۔

ان آیات میں اسلامی عقیدے کی وضاحت ملتی ہے۔ یہ عقیدہ بحیثیت انسان کے انسانیت کا اعتراف ہے۔ یہ عقیدہ ایک طرف اسے حیوان اور جمادات سے بلند مقام دیتا ہے اور دوسری طرف شیطانوں سے اور فرشتوں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے مختلف رُجحانات، میلانات اور اس کی رُوح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس پر وہ فرائض عائد کرتا ہے جن کو انسان اپنی زندگی میں ادا کر سکتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے فرائض اور اس کی صلاحیتوں اور طاقت کے درمیان بہترین توازن قائم کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے جسمانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ عقلی تقاضوں کا خیال رکھتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کی رُوحانی دنیا کو بھی آباد رکھتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرلے لیکن یہ یاد رکھے کہ:

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ

''اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

پلٹ کر جانے والے کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہیں منزل گم نہ ہو جائے، راستہ بھول نہ جاؤں، کہیں ایسا نہ ہو کہ راستہ دشوار گزار ہو اور میں مشکلات سے تھک کر بیٹھ جاؤں یا راستہ بدل دوں۔ ایک چیز انسان کو ہمیشہ چلاتی ہے:

وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ

جانا جو اس کی طرف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر منزل کو اپنے سامنے رکھ لے، اسے پتہ ہو کہ وقت دوبارہ نہیں ملے گا تو وہ چاہے کتنی مشقت میں ہو برداشت کر لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے۔ جب انسان اپنے مشن کو سامنے رکھ لیتا ہے تو ہر حالت میں اس کو پورا کرتا ہے اور یہی انسان اگر ربّ کی ذات کو سامنے رکھ لے اور ربّ کی طرف لوٹ جانے کو سامنے رکھ لے تو ساری مشکلات برداشت کر جاتا ہے۔ انسان کو بھوک لگی ہو، پیاس لگی ہو، اس کا سانس نکل رہا ہو، کچھ بھی ہو، کیسی ہی حالت ہو، پھر انسان چلتا ہے، پھر انسان کوشش کرتا ہے، کہ میں کسی طرح اس کی رحمت کے حصار میں پہنچ جاؤں۔

جیسے ننانوے قتل کرنے والے شخص کی بات ہمیں حدیث میں ملتی ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا، اس نے ننانوے قتل کیے۔ وہ ایک راہب کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ تمہاری معافی کی کوئی گنجائش نہیں تو اس نے اسے بھی قتل کر دیا۔ اب پورے سو ہو گئے۔ وہ guilt میں تھا، پھر کسی اور کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ تم اس بستی سے، گناہوں کی سرزمین سے باہر نکل جاؤ۔ وہ جب وہاں سے نکلا تو اس کی موت کا وقت آ چکا تھا۔ اب وہ چلتا چلا گیا۔ جس وقت ایسے مقام پر پہنچا جہاں جان قبض کرنے والے فرشتے پہنچے تھے تو فرشتوں کے درمیان tie پڑ گئی کہ وہ شخص کس علاقے سے زیادہ قریب ہے؟ کس طرف اسے شمار کریں اور وہ شخص تھا کہ اپنے آپ کو سینے کے بل بھی اٹھا کے دوسری طرف گرا رہا تھا کہ میں اس علاقے میں شمار کر لیا جاؤں جو نیکوں کی بستی ہے، جہاں مجھے معافی مل جائے گی جس کی وجہ سے میرا ربّ مجھے معاف کر دے گا کیونکہ زندگی میں کوئی نیکی کی نہیں تھی سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف چل پڑا کہ نیکوں کی سرزمین میں جاؤں گا اور نیک کام کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں سے کہا کہ آپ ناپ لو، کدھر کا فاصلہ زیادہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کی اور وہ فاصلہ کم

نکلا جو نیکوں کی بستی کی طرف تھا اور یوں اسے ان لوگوں میں شمار کر لیا گیا۔ (صحیح بخاری 3470) پتہ کیا چلتا ہے کہ ایک انسان نے نیت کر لی کہ میں نے ربّ کی طرف جانا ہے تو ربّ کی طرف جانے کے احساس نے اس سے وہ کام کروالیا جس سے اس کی جنت کا راستہ آسان ہو گیا۔

لوٹ کر جانے والے کا عقیدہ کیا بن جاتا ہے؟ ایک انسان مشکل میں ہے تو ایک طرف اسے اپنی مشکل نظر آتی ہے اور دوسری طرف ربّ! ایک انسان شعوری طور پر اپنے آپ کو اپنے ربّ کے حوالے کرتا ہے کہ میں نہیں میرا ربّ، وہی ہوگا جو میرا ربّ چاہے گا، میری چاہت نہیں میرے ربّ کی چاہت، میں نہیں بلکہ میرا رزق دینے والا، میں نہیں بلکہ میرا پیدا کرنے والا، میں نہیں بلکہ وہ جو میرا مالک ہے، جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس نے میرا وارث ہو جانا ہے، میں نے اُسی کی طرف نظر لگانا ہے، میں نے اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لوٹ کر جانے کی بات ایسی ہے جو انسان کی زندگی کو تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے اور اب آپ پلٹ کر آیئے اس روایت کی طرف کہ یہ آیت دو نوروں میں سے ایک نور ہے، اس آیت میں روشنی ہے، دل کی دنیا روشن ہوتی ہے اور زندگی بدل سکتی ہے۔ آخری آیت ہے سورۃ البقرہ کی:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ؕ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ٝ وَاغْفِرْ لَنَا ٝ وَارْحَمْنَا ٝ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (286)

”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جو کوئی نیکی کرے اس کی جزا اس کے لیے ہے اور جو کوئی برائی کرے تو اس کا وبال اسی پر

ہوگا۔اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑنا۔ اے ہمارے رب! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالنا جس طرح کا بوجھ ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔اے ہمارے رب! ہم پر ان اعمال کا بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر فرما اور ہماری گناہ بخش دے، ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مولا ہے۔ پھر انکار کرنے والوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما"۔

آیت میں پہلی توجہ طلب بات ہے: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ

اللہ تعالیٰ کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی کو اُس کی قدرت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ یہ سورۃ البقرہ کا اختتام ہے اور اختتام کے حوالے سے اگر دیکھیں تو احکامات کے بعد یہ بڑا ہی خوبصورت اختتام ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اُس کی قدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

دو باتوں میں فرق دیکھیں گے: جس کسی نے خیر کمایا اس کے لیے، جس کسی نے شر کمایا اس کے لیے تو کسب اور اکتساب میں جو فرق ہے اس کو دیکھیں گے۔ اگلی چیز ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا

"اے ہمارے رب! ہمارا مواخذہ نہ کرنا"۔

مؤاخذہ کو دیکھیں گے، بھول چوک، غلطی کو اور اگلی بات ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

کس کے لئے؟

''اے ہمارے رب! ہم پر بوجھ نہ لاد دینا جیسا کہ پہلے لوگوں پر لادے تھے''۔

یہ بوجھ کون سے ہیں؟ اور اگلی بات ہے:

وَلَا تُحَمِّلْنَا

''ہم پر سوار نہ کر دینا''۔

کس چیز کو؟ جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ وہ کون سی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی پر سوار کر دی جاتی ہے؟ اسی طرح ہم دیکھیں گے:

وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْلَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا

اور آخری بات ہے:

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (286)

''کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائیے''۔

بہت ہی خوبصورت اختتام ہے کہ اب یہ دُعا ہے کہ اسلام پر چلنے کے لیے انکار کرنے والوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمایئے۔ آیئے تفسیر دیکھتے ہیں:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

''اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے''

ایک بات جو ربّ کی طرف سے کہی گئی کہ جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اس کو کرنے کی آپ میں طاقت موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ طاقت سے زیادہ کبھی بوجھ نہیں ڈالتا۔ طاقت سے زیادہ کون سی چیزیں انسان پر آتی ہیں؟ آزمائشیں۔ آزمائش بھی طاقت کے مطابق ہی آتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ میری وسعت، میری استطاعت میں نہیں ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ

کس کے لئے؟

’’خوشخبری دے دو صبر کرنے والوں کو‘‘۔

صبر کرنا ممکن ہے اسی لیے تو صبر کرنے کو کہا گیا۔

اَلَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

(البقرہ:156)

’’جب کبھی ان پر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم تو ہیں ہی اللہ تعالیٰ کے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے‘‘۔

آزمائش پر انسان کا دل اس طرح مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرے ربّ نے میرے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ تاریخ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ صبر کرنے والی خواتین اور صبر کرنے والے مرد۔ مردوں میں صبر مشہور ہے حضرت ایوب علیہ السلام کا، اٹھارہ برس تک Skin disease برداشت کی، جسم میں کیڑے پڑ گئے لیکن ربّ سے شکوہ نہیں کیا۔ سب کچھ چھن گیا تھا، پھر بھی صبر ہے اور خواتین بھی بہت ایسی گزریں جنہوں نے صبر کیا، صبر کی چٹان بن گئیں، لوگوں کے لیے مثال بن گئیں۔ آپ دیکھئے اللہ تعالیٰ ہر ایک پر اس کی وسعت کے مطابق بوجھ ڈالتا ہے لیکن کسی کے بچے کا انتقال ہو جائے اسے کیسا لگتا ہے؟ کہ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ اگر مالی نقصان ہو جائے تو انسان کو کیسا لگتا ہے؟ ٹوٹل Loss، بنک کرپٹ ہو گیا، انسان کہتا ہے کہ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ ایک انسان کو کیسا لگتا ہے؟ جب اس کے سارے اسباب و وسائل ختم ہو جائیں، لوگوں کی نظروں سے عزت ختم ہو جائے، کوئی ایک بات اس کو سارے زمانے میں رسوا کر جائے۔ ایسا لگتا ہے ناں کہ یہ برداشت سے باہر ہے، یہ کام ہو نہیں سکتا، یہ میری استطاعت سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

”اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا، تکلیف نہیں دیتا“۔

موقع پر ثبوت دینا پڑتا ہے ایمان کا، لِـلّٰـهِـیَّـتْ کا کہ ہم واقعی اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن موقع آتا ہے تو کتنے ہی لوگ ہیں جنہیں اپنی فکر پڑ جاتی ہے کہ ہمارا کیا ہوگا؟ اور ہمارے ساتھ بہت زیادتی ہوگئی اور کل کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا

میں نے تو کسی کی وسعت سے بڑھ کر اس پر کبھی بوجھ ڈالا ہی نہیں۔ اس بات کو انسان دل سے تسلیم کر لے تو فرائض کی ادائیگی میں اسے کبھی کوئی شک، کوئی وسوسہ نہیں آتا۔ تسلیم نہ کرے تو وسوسے آتے ہیں۔ ہر موڑ پر اسے لگتا ہے کہ یہ بہت بھاری ہے، یہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا

”اللہ کسی نفس پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا“۔

انسان پر اس آیت کے اثرات بہت گہرے مرتب ہوتے ہیں۔ انسان سوچتا ہے کہ اس کا ربّ رحیم ہے، اس نے مجھے خلیفہ بنایا، مجھ پر ذمہ داریاں عائد کیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے آزمائش ڈالی ہے۔ مجھے اس نے وسعت والا دیکھا تو یہ آزمائش مجھ پر ڈالی۔ یہ میری طاقت کے مطابق ہے۔ قیامت کے دن بھی ٹھیک ٹھیک انصاف ہوگا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا

یقین رکھنے والا فرائض کی ادائیگی میں کبھی تنگی محسوس نہیں کرتا، ذمہ داریوں کو بوجھ نہیں سمجھتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اگر میرے اندر یہ فرائض ادا کرنے کی طاقت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ مجھ پر یہ فرائض عائد ہی نہ کرتا۔ ایمان والے کا دل اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ جب بھی ایسا

"جو کوئی نیکی کرے اس کا اجر اس پر ہے اور جو کوئی برائی کرے اس کا وبال اس پر ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بحیثیت ایک فرد کے اپنے ربّ کے سامنے حاضر ہوگا، کسی شخص کو وہاں مدد کی، سفارش کی اُمید نہیں ہوگی۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اس تصور کے انسان کی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہی تو عقیدہ ہے جو خراب ہے کہ اپنے اعمال کام آنے والے ہیں اور اسی طرح سے یہ عقیدہ بھی تو خراب ہے کہ انسان دوسروں کو تو کہہ لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا اور جب اپنے اوپر پڑے تو کہتا ہے کہ مجھ سے تو یہ برداشت نہیں ہوسکتا، میں اس قابل ہی نہیں تھا۔ ربّ جانتا ہے یا ہم؟ یقیناً ربّ زیادہ جانتا ہے تو جو شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار خود کو محسوس کرتا ہے اس کی زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے؟ یہ تصور انسان کے دل میں راسخ ہوجاتا ہے تو انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق کا ذمہ دار بن جاتا ہے اور دوسرے انسانوں کے حقوق میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں کرتا۔ ایک مومن یہ سوچتا ہے اگر کبھی کوئی گمراہ کر کے، دھوکہ دے کے، مجبور کر کے مجھ سے اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کرا دے تو قیامت کے دن ان سارے انسانوں میں سے کوئی میرے کام نہیں آئے گا۔ یہ نہ تو مداخلت کر سکیں گے، نہ سفارش ہی کر سکیں گے اور نہ میرا بوجھ اتار سکیں گے۔ وہ معاشرے میں اپنی اجتماعی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بارے میں پوری طرح سے فکر مند ہوتا ہے کہ میری یہ responsibilities ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ذمہ داریاں نبھتی ہی یہاں سے ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

کیونکہ ایک انسان کو یقین ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنا ہے۔ اس طرح ہمیں پتہ لگتا ہے کہ اس عقیدے کی وجہ سے مومن اپنے مال اور اپنی دولت سے بھی اجتماعی

ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔ایسا شخص دوسروں کوتو اصوابالحق کرنے کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔وہ معاشرے سے باطل کومٹانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ معاشرے میں سچائی اور بھلائی کو پختہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اعمال نامے میں اجتماعی معاملات کے حوالے سے بھی اس کی ساری کارکردگیاں اورکوتاہیاں فی ظلال القرآن ہوں گی۔اس تصور کی وجہ سے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کا سچا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میرا کیا ہوا عمل ہی میرے کام آنے والا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

"اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں تو ہمیں نہ پکڑنا"۔

ایک انسان اپنی کمزوریوں کو جانتا ہے۔انسان بھول سکتا ہے،وہ غلطیاں اور خطائیں کرسکتا ہے اور یوں وہ رب سے دور ہو جاتا ہے۔کتنی خوبصورت دُعا ہے جواللہ تعالیٰ نے سکھائی! آپ یہ دُعا کرو:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک ہوسکتی ہے،غلطیاں خطائیں ہوسکتی ہیں۔ آپ ہمیں معاف کردیں، ہمارا مواخذہ نہ کریں۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ بَنِىْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَّخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ (جامع ترمذی:2499)

"تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں"۔

ایک خطا کار بہتر کیسے ہوسکتا ہے؟ توبہ کی وجہ سے۔توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انسان کو قبول کر لیتا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ

کون کہہ سکتا ہے یہ؟ جس کو پتہ ہو کہ میں اپنے ربّ کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ احساس چھوٹا نہیں ہے کہ میں نے ربّ کی طرف پلٹنا ہے۔ اس احساس کی وجہ سے ایک انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ربّ میرا مواخذہ کرے گا۔ اس گزرے وقت میں دیکھئے کہ کب کب یہ یقین آتا ہے کہ میرا ہر قدم میرے ربّ کی طرف بڑھ رہا ہے؟ ہر لمحہ زندگی سے دور ہوتے ہیں۔ جب صبح آئے تھے تو زندگی سے زیادہ قریب تھے، اب دور ہو گئے ہیں۔ موت کے قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ احساس دلاتے ہیں کہ:

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ

''اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے پھر اس سے ملاقات کرنے والا ہے''۔

یہ جو جانے کا احساس ہے، یہ کہلواتا ہے: ربنا لا تؤاخذنا۔ ''اے ہمارے ربّ! ہم سے مواخذہ نہ کرنا''۔

اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا

''اگر ہم کوئی غلطی کریں یا ہم بھول جائیں''۔

جان بوجھ کر انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرے تو معافی کی گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے اُس کی طرف رجوع کرنا معافی کی شرائط میں سے ہے۔ یہاں پر دو الفاظ ہیں: ایک ان نسینا اور دوسرا ہے او اخطانا۔

نسینا ہم بھول جائیں۔ بھول چوک سے کیا مراد ہے؟ انسان جان بوجھ کر نافرمانی نہ کرے، اپنی غلطی پر مُصر نہ ہو، انسان تکبر کی وجہ سے نافرمانی نہ کرے، انسان ارادے کے ساتھ ٹیڑھے راستے پر نہ چلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری اُمّت سے خطا اور نسیان پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا جب تک انہوں

نے ایسے کاموں کو برا نہ سمجھا"۔ (طبرانی)

اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک مومن اگر برائی کو برا سمجھتا رہے اور برائی سے بچنے کی کوشش کرتا رہے، پھر بھی اگر وہ برائی میں پڑ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ پھر مواخذہ نہیں کرے گا کیونکہ گناہوں سے معافی مانگنا اس کا شیوہ ہے، گناہوں سے بچنے کی وہ کوشش کرتا ہے، برائی کو برائی سمجھتا ہے۔

خطا کیا ہے؟ خطا بھی دراصل غلطی ہے لیکن اس میں تکبر نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے کہ ایک انسان کو پتہ ہے کہ مالک کا حق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے لیکن وہ جان بوجھ کر ایسا نہ کرے۔ جان بوجھ کر جو غلط کام کیا جاتا ہے وہ گناہ ہے۔ اثم گناہ کو کہتے ہیں اور آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو لیکن جان بوجھ کر نہ چلے۔ لہٰذا گنہگار وہ ہے جو نیکی کے کام کر سکتا ہو لیکن جان بوجھ کر نہ کرے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا دل نہیں مانتا۔ نیکی کے کاموں کے لیے دل کی طرف نہیں، ربّ کی طرف دیکھنا ہے اور اپنے لوٹ جانے کی طرف دیکھنا ہے۔ لوٹ جانے کا احساس انسان کو چلاتا ہے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ
رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

"اے ہمارے ربّ! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالنا جس طرح کا بوجھ ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے ربّ! ہم پر ان اعمال کا بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو"۔

یہ دُعا انسان کی زبان پر کب آتی ہے؟ جب انسان ذمہ داری قبول کر لیتا ہے تب وہ کہتا ہے: اے اللہ! میری طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنا جو پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ جب انسان ذمہ دار بن جاتا ہے تو ایسی دُعائیں کرتا ہے۔ جب وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ پر

تمام رسولوں کی رسالت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ جب وہ پچھلی قوموں کے حالات جان لیتا ہے کہ رسولوں کی نافرمانی کی پاداش میں ان پر کیا کیا بوجھ ڈال دیئے گئے تو وہ دُعا کرتا ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ إِصۡرٗا كَمَا حَمَلۡتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِنَا

''اے ہمارے ربّ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے''۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی اُمتوں پر کب یہ بوجھ ڈالے گئے؟ کون سے بوجھ ڈالے گئے؟ نافرمانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بوجھ ڈالے تھے۔ مثال کے طور پر بنی اسرائیل پر بعض قسم کی پاکیزہ غذائیں حرام کردی گئیں۔ جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر سب ناخن والے جانور حرام کر دیے گئے۔ گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی گئی۔ انہیں بچھڑا پوجنے کی سزا کے طور پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم ملا۔ ان پر سبت کے دن شکار کو حرام کیا گیا۔ اسی لئے اہلِ ایمان کو دُعا سکھائی گئی کہ تم یوں کہو: اے ہمارے ربّ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے گئے تھے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان پر بڑے سے بڑا بوجھ جو ڈالا جا سکتا ہے وہ کیا ہے؟ کہ انسان دوسرے انسان کو اپنا غلام بنالینا چاہتا ہے۔ اپنے نظریے سے غلامی کے بوجھ تلے دبا دینا چاہتا ہے۔ انسان پر سب سے بڑا بوجھ انسان کی غلامی کا ہے اور اس بوجھ کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ انسان کے لئے انسان ضابطۂ حیات بناتا ہے۔ انسانوں کی ایک نسل دوسری نسل کے ماتحت ہو جاتی ہے۔ انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کا غلام ہو جاتا ہے۔ یہ بوجھ ہے۔ اسی طرح اگر انسان انسانوں کی طرف سے دیے جانے والے نظریۂ حیات کو قبول کر لے تو آنے والی ساری نسلیں غلام ہو جاتی ہیں۔ انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کا غلام

ہو جاتا ہے، ایک قوم دوسری قوم کی غلام ہو جاتی ہے۔ کیا دنیا میں آج انسان انسان کا غلام ہے؟ کسی کی مانتا ہے؟

مثلاً آپ دیکھیں آپ کپڑے پہننا چاہتے ہیں، آپ وہ چیزیں لینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں جن کو پذیرائی حاصل ہو۔ زیادہ نہ سہی چلو حدود کے اندر ہی سہی۔ ایک بوجھ تو ہے کہ اگر ایسا نہ کیا تو میرے لیے سوسائٹی میں acceptance نہیں ہوگی، پھر میرے بارے میں لوگ کیا سوچیں گے؟ میں چھوٹی سی ایک مثال دے کر یہ واضح کرنا چاہتی ہوں کہ انسان پھنسا ہوا ہے۔ کہیں والدین، اہلِ خاندان گھر والوں کے لیے قانون بناتے ہیں کہ یہ ہمارا family trend ہے، ہم اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔ رسم و رواج بھی تو انسان کے اوپر لادے جانے والے بوجھ ہی ہیں اور رسم و رواج کی پابندی کرنا دراصل غلامی کرنا ہے۔ پھر اسی طرح کئی شوہر بیویوں کے لیے ضابطۂ عمل بناتے رہتے ہیں اور خدا کے مقابلے میں کوئی جب اپنا قانون بنا کر سامنے لے آئے تو دراصل یہ غلامی ہے اور آپ دیکھیں کیا ایک اللہ تعالیٰ کے غلام کو اپنا غلام بنانے سے بڑا بھی کوئی جرم ہو سکتا ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں پر سے انسان کی غلامی کو ختم کرنے کی کوشش کیسے کی گئی ہے؟

1۔ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نبی کی بعثت کا مقصد یہی ہے کہ وہ اہلِ ایمان اور پوری انسانیت سے وہ بوجھ اتار دے جو انسانیت پر ڈالے گئے تھے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ساری غلامیوں سے چھڑا کر ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ذریعے پوری انسانیت کے لئے آزادی کا راستہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کس کے لئے؟

4۔انسان کو مذہبی پروہتوں، کاہنوں اور پیشواؤں کی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

5۔انسان کو اوہام وخرافات سے آزاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

6۔انسان کو رسم ورواج کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

7۔انسان کو خواہشات اور مرغوبات کی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

8۔ایسی غلامیاں جنہوں نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی جس کی وجہ سے انسانوں کے سر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں دوسرے جباروں کے سامنے جھکتے تھے، ساری غلامیوں سے آزاد کروانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام غلامیوں کو اتار پھینکنے کا راستہ ہے۔ دنیا میں انسان کو ہمیشہ باندھ کے رکھا گیا ہے۔ جانتے ہیں کس نے ایسا کیا ہے؟ مذہبی پروہتوں نے، کاہنوں نے، مذہبی رہنماؤں نے، پھر اسی طرح ریاست کے بادشاہوں نے غلامی میں باندھا۔ بادشاہ تو غلام بناتے ہیں، یہ مذہبی رہنما کیسے غلام بناتے ہیں؟ اپنی طرف سے ایسے رسوم ورواج دیتے ہیں، ایسی چیزوں کو دین کے نام پر پیش کرتے ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سارے لوگ مجبور ہوتے ہیں۔

میں مثال کے طور پر آپ کے سامنے رکھتی ہوں۔ ایک بیوہ عورت کا ایک پلاٹ تھا۔ کہنے لگیں کہ میرے سات چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میرے پاس یہ واحد پلاٹ ہے لیکن میرے اہلِ خاندان کہتے ہیں کہ اسے بیچ دو، تمہارے شوہر کی سات جمعراتیں کرنی ہیں، سات جمعراتوں پہ پلاٹ لگ جائے گا۔ مجھے بتایئے میں کیا کروں؟ میں نے کہا کہ ربّ نے تو آپ کو یہ پلاٹ لگانے کے لیے نہیں کہا۔ یہ تو وارثوں کا ورثہ ہے، انہیں پہنچنا چاہیے۔ آپ یہ کام کس طرح کرنا چاہتی ہیں؟ کہنے لگیں: میں مجبور ہوں کہ میرے سسرال والے، مولوی

صاحب اور باقی لوگ کہتے ہیں کہ سات جمعراتوں کے بغیر تو اُس کی بخشش ہی نہیں ہوگی۔ کیا یہ انسانوں پر ڈالا جانے والا بوجھ نہیں ہے؟ کوئی انسان اگر ایک کھجور کی گٹھلی بھی کسی مردے کے لیے نہیں دے سکتا تو پابند نہیں ہے۔ ایک انسان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو وہ کیسے دے؟ ہر انسان کے کام اس کے اپنے اعمال آنے والے ہیں۔ اپنے اعمال کی فکر کرلینی چاہیے۔ جانے والوں کے لیے انسان اتنا ہی کرے جتنی ہستی ہو۔ دیکھیں جانے والا تو چلا گیا، سارا مال اس پر لگا دے تو زندہ لوگوں کی حالت مردوں سے بھی ابتر ہو جائے، وہ دو وقت کی روٹی کے لیے بھی محتاج ہو جائیں۔ اس طرح مذہبی رہنما (معذرت کے ساتھ) انسانوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ملک کا سربراہ ہو اور قانون بدل دے اور اللہ کے قانون کے مقابلے میں انسانوں کے بنائے قانون کو لے آئے اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنائے ہوئے قانون کی جگہ دینے کی کوشش کرے تو یہ انسانوں کو ربّ کی غلامی سے نکال کر اپنا غلام بنانا ہے، اپنے قانون کے ماتحت لانا ہے۔ اگر انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے چھڑانا ہے تو انسانوں کے بنائے قوانین سے اسے نکالنا ہے۔ مذہبی لیڈروں کی طرف سے جو پابندیاں عائد کی گئیں، جن کا دین سے تعلق نہیں، ان سے چھڑانا ہے۔ اسی طرح اوہام و خرافات سے نکالنا ہے، رسوم و رواج کی پابندیوں سے نکالنا ہے، خواہشات اور مرغوبات کی پابندیوں سے بھی آزاد کرانا ہے۔

آپ دیکھیں انسان اپنے Taste کا غلام ہے۔ جس چیز کا ذائقہ اسے اچھا لگتا ہے وہ کھاتا ہے، نہ اچھا لگے تو بھلے سے اس کی مجبوری ہو reject کر دیتا ہے۔ اس ذائقے کے لیے سارا دن مصروف رہتا ہے۔ اچھا ذائقہ ہو، ناشتے میں اچھا taste آئے، دوپہر کے کھانے میں، شام کی چائے میں، رات کے کھانے میں، آگے پیچھے ہر وقت ذائقے کا غلام ہو گیا

انسان۔اسی طرح اپنی نیند کا غلام ہوگیا، ہروقت آرام کی فکر، ہروقت اپنی عزت کی فکر، ہر وقت اپنی دولت کی فکر۔غلام نہیں ہے انسان؟ خواہشات اور مرغوبات کا غلام ہے۔اللہ والے جو کوششیں کریں گے خواہشات اور مرغوبات کی غلامی سے نکالنے کے لیے بھی کریں گے۔

اس دنیا میں ایسی غلامیاں ہیں جس نے انسان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔انسانوں کو ربّ کے سامنے جھکانے کی بجائے انسان کے سامنے جھکایا جاتا رہا۔انسان کی پرستش، انسان کی بندگی کروائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر شوہر کی اطاعت کرنا بیوی کا فرض ہے لیکن ربّ کے قانون کے مقابلے میں نہیں۔عام طور پر ماں نصیحت کرے گی، دادی نصیحت کرے گی، نانی کرے گی، سسرال والے نصیحت کریں گے، ملنے والے نصیحت کریں گے کہ شوہر کی اطاعت کرلو۔کوئی بات نہیں ربّ تو معاف کردے گا اگر ربّ کی مرضی کے خلاف ہوگیا لیکن شوہر کے تو ساتھ رہنا ہے اور آج ہی اگر شوہر کا انتقال ہوجائے تو سمجھ آجائے کہ کس کے ساتھ رہنا ہے؟ ایک عورت کو ہمارے معاشرے میں پوری طرح شوہر کا غلام بنا کر اس کے حوالے کیا جاتا ہے۔عقدِ نکاح کو لوگوں نے عقدِ غلامی بنالیا کہ یہ غلامی کا رشتہ ہے۔اسی وجہ سے آپ دیکھئے کہ اسلام جن چیزوں کے حقوق عورت کو دیتا ہے، وہ حقوق بھی نہیں دیئے جاتے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ مال عورت رکھ سکتی ہے، خرید سکتی ہے، بیچ سکتی ہے، اس کی جائیداد اس کی ملکیت ہے۔اس کے لیے وہ مشورہ لے لے تو اس کی مرضی ہے ورنہ اگر وہ فروخت کرنا چاہے تو اس کا مال ہے، وہ bound نہیں ہے لیکن ہمارے ہاں عورت کو آزادی سے کوئی فیصلہ نہیں کرنے دیا جاتا۔کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ناقص العقل ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس عورت کی عقل آپ سے بڑھ کر ہو جو آپ کی بیوی ہے۔یہ ضروری تھوڑا ہے کہ سارے ہی مرد فاطر العقل ہوگئے، سارے ہی مرد عقل کے اعلیٰ مقام پہ پہنچ گئے! کتنے ہی مرد ہیں جو

خواتین کے مقابلے میں بہت تھوڑی عقل رکھتے ہیں۔ یہ تو محض لوگوں کو غلام بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل پیش کرنا اوراس کی بنیاد پر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ ایسے کوئی انسان حق پر نہیں ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان غلامی سے آزاد ہو جائے۔ انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے تو اللہ والوں کا یہی کام ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامیوں سے آزاد کرالیں۔ یہ انسانیت پر سب سے بڑا بوجھ ہے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

"اللہ! ہم پر اس طرح کے بوجھ نہ ڈالنا جیسے پہلے لوگوں پر بوجھ ڈالے تھے"۔

جیسے پہلے لوگوں پر آزمائشیں آئیں تھیں۔ اگر دوسرے angle سے دیکھیں تو آزمائش ایک لحاظ سے بوجھ ہے۔ مثال کے طور پر پہلے لوگوں کے لیے گڑھے کھودے جاتے تھے، ان میں آگ بھروائی جاتی تھی اور ان میں زندہ انسانوں کو پھنکوا دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے تیل کے کڑاہ ہوتے تھے جن کے اُبلتے ہوئے تیل میں ایمان والوں کو ڈال دیا جاتا تھا، گڑھے کھود کر اس میں زندہ انسانوں کو کھڑا کر کے انہیں آرے سے چیر دیا جاتا تھا کہ تم یہ کیوں کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے؟ اتنی rigidity ہے کفر میں، برداشت ہی نہیں کرتے کہ ہماری سوچ کے علاوہ کوئی اپنی سوچ ذہن میں رکھ سکے، چاہے وہ سوچ صحیح ہو اجازت نہیں دیتے کہ انسان اپنی عقل کا استعمال کر کے صحیح سوچ کو اپنے ذہن میں رکھے۔ سوچ کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔ جیسے میڈیا کی وجہ سے پوری دنیا میڈیا پر آنے والے پروگرامز کی اور ان کے توسط سے دیئے جانے والے خیالات کی غلام بنالی گئی تو انسان کیسے اس غلامی سے بچ سکتا ہے؟ تبھی جب اللہ والے کوششیں کریں گے، اس غلامی سے آزاد کروائیں گے۔ غلامی سے آزادی کا راستہ علم کا راستہ ہے، قرآن کا راستہ، کلام اللہ کا راستہ۔ اس راستے پہ آنے والے غلامیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

دُعا کا اگلا حصہ ہے:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

''اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو''۔

اس دُعا سے ایمان والوں کے شعور کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ انسان کی غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں۔

1۔انسان کو یہ خوف ہے کہ کہیں اپنی غلطیوں کی وجہ سے دوبارہ اس غلامی میں نہ چلے جائیں۔

2۔اس دُعا سے مکمل سپردگی کا اظہار ہوتا ہے۔

3۔اس دُعا سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہلِ ایمان کے اندر سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کا ارادہ نکل گیا ہے۔

4۔اس دُعا سے مومن کے پختہ ارادے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اطاعت کرے گا۔

5۔یہ پتہ چلتا ہے کہ غلطی کا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت مکحول افرماتے ہیں: اس سے مراد فریب اور غلبۂ شہوت ہے۔(تفسیر ابن کثیر، جلد 1: 386) کہ ایک انسان یہ غلطی کر سکتا ہے کسی فریب میں آجائے، شیطان کے کسی جھانسے میں آ جائے یا اس پر خواہشات کا غلبہ ہو جائے۔

وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (286)

''ہم سے درگزر فرما، ہمارے گناہ بخش دے، ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مولا ہے، پھر انکار کرنے والوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما''۔

دنیا کا امتحان ہے اور اس امتحان میں کامیابی کے لیے ربّ کا دیا ہوا پروگرام ہے۔اس

امتحان میں کامیاب ہونے کی گارنٹی کیا ہے؟

1۔اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو جائے۔

2۔اللہ تعالیٰ عفوودرگزر سے کام لیں۔

3۔اللہ تعالیٰ رحمت فرمائیں۔

4۔اللہ تعالیٰ نرمی سے کام لیں۔

5۔انسان جتنی بھی محنت کرے، وفاداری کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے، اس کے کام میں کمی رہ جاتی ہے۔ایسے موقعے پر اللہ تعالیٰ کی اُمید انسان کا سہارا بنتی ہے۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ A ! مَا النَّجَاةُ ؟ قَالَ : اَمْلِکْ عَلَيْکَ لِسَانَکَ وَلْيَسَعْکَ بَيْتُکَ وَابْکِ عَلٰی خَطِيْئَتِکَ . (جامع ترمذی:2406)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! نجات کیا ہے؟ فرمایا: ''اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے لیے تمہارا گھر کشادہ ہونا چاہیے (کہ فضول مجلس کے بجائے اپنے گھر میں بیٹھے رہو) اور اپنے گناہوں پر (ندامت سے) رویا کرو''۔

یعنی تم گھر لوٹو تو تمہارے گھر والے تمہارا انتظار کرنے والے ہوں، تمہاری گھر میں جگہ ہو۔ظاہر ہے کہ ایک انسان دوسروں کے حقوق ادا کرتا ہے، ان کے درمیان اچھا وقت گزارتا ہے، ان کو مجبور کر کے نہیں رکھتا، ذہنی ٹارچر نہیں دیتا، تب اس کی اس کے گھر میں گنجائش رہتی ہے۔اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ وہ ہمیں معاف کردے اور کس انداز میں کہ:

اَنْتَ مَوْلٰنَا

''تو ہمارا مولا ہے''۔

یعنی دنیا میں فقط تو ہی تو ہمارا سہارا ہے۔ تیرا حکم ہے، تیری چاہت ہے، تیرا ارادہ ہے کہ اس دنیا میں تیرا دین غالب آئے تو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تو ہمارا مولا ہے، تو ہماری مدد فرما۔ اہلِ ایمان اپنے ایمان سے اپنی پہچان کرواتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتے ہیں:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو"۔

آپ دیکھیں کہ آخر میں یاد دلایا جا رہا ہے:

اَنْتَ مَوْلٰنَا

"تو ہمارا مولا ہے"۔

پھر آپ دیکھئے کہ جو یہ کہتا ہے:

اَنْتَ مَوْلٰنَا

وہ جاہلیت کی ہر علامت، ہر بت، ہر محبت، ہر رغبت کو توڑ کر ایک اللہ تعالیٰ کے سائے میں آ جاتا ہے۔ اَنْتَ مَوْلٰنَا تو ہی ہمارا مولا ہے، ہماری زندگی، ہماری نمازیں، ہماری قربانیاں سب تیرے لیے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ سے مومن کا سچا تعلق ہے۔ **فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ** کی وضاحت کر کے دین کو پھیلانا چاہتے ہیں، اس کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔ اہلِ کفر کے ساتھ مقابلہ ہے، آپ ہی والی ہیں، آپ ہی وارث ہیں، آپ ہی کے لئے جینا ہے اور آپ ہی کے لئے مرنا ہے، آپ ہماری مدد فرمائیں۔ یا اللہ! ہم تیرے دین کو قبول کرنا چاہتے ہیں، اس کو ماننا چاہتے ہیں، اس پر چلنا چاہتے ہیں لیکن نہ تو کوئی ہمیں چلنے دیتا ہے، نہ کوئی دوسروں کو اس راستے پہ چلانے دیتا ہے۔ یا اللہ! یہ ہمارے راستے کی رکاوٹیں ہیں، ان کے مقابلے میں آپ ہماری مدد فرمائیں اس لیے کہ آپ ہی ہمارے والی ہیں، آپ

ہی ہمارے وارث ہیں، آپ ہی کے لیے ہمیں جینا ہے، آپ ہی کے لیے ہمیں مرنا ہے، آپ ہماری مدد فرمائیے۔ بہت ہی پیاری روایت ہے:

عَنِ الْبَرَاءِ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ اَبُوْسُفْيَانَ : اُعْلُ هُبَل ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اَجِيْبُوْهُ قَالُوْا : مَا نَقُوْلُ ؟ قَالَ : قُوْلُوْا : اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ قَالَ اَبُوْسُفْيَانَ : يَوْمٌ بِيَوْمِ بَدْرٍ وَالْحَرْبُ سِجَالٌ وَتَجِدُوْنَ مُثْلَةً لَمْ آمُرْ بِهَا وَلَمْ تَسُؤْنِيْ . (صحیح بخاری:4043)

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ احد کے موقع پر ابوسفیان نے کہا: ہبل بلند رہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کا جواب دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیا جواب دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہو: ''اللہ تعالیٰ سب سے بلند اور بزرگ و برتر ہے''۔ ابوسفیان نے کہا: ہمارے پاس عزیٰ (بت) ہے اور تمہارے پاس کوئی عزی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا جواب دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا جواب دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہو: ''اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہے اور تمہارا کوئی حامی نہیں''۔

یہ دُعا اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ ایمان والے اپنی کمزوریوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، انہیں احساس ہے کہ ہم محتاج ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی، اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہے۔ ایمان والے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں، ایک اللہ سے تعلق جوڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا دوسروں سے کٹ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لئے تیار ہیں، اسی سے نصرت چاہتے ہیں۔

کتنی خوبصورت دعا ہے! نبی ﷺ نے اس کو اپنی رات کی خاص دعا بنالیا تھا۔ یہ وہ آیات ہیں جن کے بارے میں صحیح بخاری میں ہے:

کس کے لئے؟

’’جو شخص ان دونوں آیات کو رات کو پڑھ لے یہ اس کو کافی ہیں۔‘‘

یہ آیت عرش تلے کا خزانہ ہے۔ یہ سب سے بڑا سرمایہ ہے جو امتِ مسلمہ کو دیا جا رہا ہے۔

کس کے لئے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیات عرش تلے کا خزانہ ہیں۔ یہ سب سے بڑا سرمایہ ہے جو اُمت مسلمہ کو دیا جارہا ہے۔ بات شروع ہوئی تھی لِلّٰہ سے۔ اللہ کے لئے۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ یہی کائنات کی بنیاد ہے۔ آسمان اُسی کے ہیں، اُسی کے حکم سے قائم ہیں، زمین اُسی کی ہے، اُسی کے حکم سے چلتی ہے۔ وہی اس کائنات کا رازدان ہے۔ کچھ بھی اُس سے چھپا ہوانہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں اور نہ ہی انسانوں کے دلوں میں۔ ہر چیز کو اُس نے ایک حساب میں باندھ رکھا ہے۔ انسان بھی اُس کے حساب میں بندھا ہوا ہے۔ اُس کی زندگی، اُس کا رزق، اُس کی موت، سب کچھ اُس کے اختیار میں ہے۔ چھوٹی سی زندگی میں انسان کو جو اختیار حاصل ہے اُس میں بھی انسان اپنے کیے کے بارے میں جواب دہ ہے۔ وہ ایک ایک چیز کا حساب لے گا چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے وہ صاحب اختیار ہے۔ اُس کے اختیارات کو رسولوں نے بھی مان لیا اور ایمان والوں نے بھی۔ ہر ایک نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے کہ تیری ہی ہم سُنیں گے اور تیری ہی ہم مانیں گے سارے ہی اُس کے اختیارات سے خوف زدہ ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ تیری زمین پر رہتے ہوئے جہاں ہم سے غلطیاں ہو جائیں ہمیں معاف کر دیجیے کہ تیری طرف ہی پلٹ کر آنا ہے۔ انسان کی دعائیں، التجائیں اُس کی رب شناسی کا اظہار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے تو اس کے مقاصد بلند ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک اللہ تعالیٰ کے لئے جینا چاہتا ہے اُسی کی خاطر مر جانا چاہتا ہے۔ اُسی کے لئے اپنے آپ کو ہر کھوٹ کو پاک کر لیتا ہے، خالص کر لیتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں ''کس کے لئے؟'' کا جواب مل جاتا ہے تو اخلاص کے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا ہے اُس نے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

پھر وہ کیوں نہ اللہ تعالیٰ کے لئے جیے؟

پھر وہ کیوں نہ اُسی کے لئے قربانیاں دے؟

کس کے لیے؟

پھر وہ کیوں نہ اُسی کے آگے سجدہ کرے؟

جب کہ اللہ تعالیٰ انسان کا رب ہے اور انسان اُس کا غلام ہے۔